تلخ حقیقت

تلخ حقیقت

(کالموں کا مجموعہ)

حمیرا جمیل

انتساب

محترم والدین

کے نام

فہرست

دیباچہ

معاشرہ میں بکھری اور سسکتی ہوئی انسانیت کو سوچنے اور سمجھنے کے بعد اس کو ضبط تحریر میں لانا کالم نگاری کے زمرہ میں آتا ہے انسانیت کی اس معراج کو لفظوں کی مالا میں جس انداز میں محترمہ حمیرا جمیل صاحبہ نے پرویا ہے ان کے تحریر کردہ کالم دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہیں کیونکہ انسانیت انسان کے بغیر کچھ بھی نہیں اور انسان انسانیت کے بغیر انسان نہیں بلکہ حیوان سے بھی بدتر ہے علامہ اقبالؒ! کا ایک شعر ایسے ہی انسان دوستوں اور خوداروں کے نام ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تری رضا کیا
ہے

اختر سلیم
قلم کار
29-12-2017

25 جنوری 2018

پیاری بیٹی حمیرا جمیل کے لیے

شہرِ اقبال کا ایک چمکتا ستارہ
فخر سے سر بلند کر دیا ہمارا

حمیرا نے ایک تعلیمی گھرانے میں مئی 1995ء کو جنم لیا۔ والد صاحب سے درس و تدریس کی دولت ورثے میں ملی ان کی پہلی کامیاب کاوش ''درد کا سفر'' بہت خوبصورت افسانوں کا مجموعہ تھی جس نے شہرت حاصل کی۔ خداداد صلاحیتوں نے رنگ دکھایا اور یہ کتاب ''تلخ حقیقت'' مکمل کی۔ چھوٹی سی نہایت منصفانہ طبیعت کی ہونہار حمیرا کو میں مبارکباد دیتی ہوں، خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں۔ پیاری بیٹی اس کے ساتھ علم کی روشنی پھیلاتی رہو۔ علامہ کی دھرتی کو چار چاند لگاتی رہو۔ نیک تمناؤں اور دُعاؤں کے ساتھ

مسز سجاد بٹ
0321-6184434

ابتدائیہ

مجھے ابھی تک یاد ہے میں کبھی بھی اُن لوگوں کو نہیں بھول سکتی جنہوں نے ہمیشہ میرا مذاق اُڑایا صرف اس بات پر کیوں کہ میں نے اپنی ذات پر دوسروں کی ذات کو ترجیح دی۔ صرف ایک انسان کے لیے ہی نہیں بلکہ سب انسانیت کے لیے سوچا۔ تلخ حقیقت یہ میری دوسری کاوش ہے اس سے پہلے میری کتاب ''درد کا سفر'' افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکی ہے جس کو قارئین نے بہت زیادہ پسند بھی کیا اور تنقید بھی کی۔ ''تلخ حقیقت'' جیسا کے نام سے واضح ہے یہ نام بذاتِ خود ایک کڑوا سچ ہے۔ اس کتاب کے کچھ کالم لکھتے ہوئے میری آنکھیں کئی بار اشکبار ہوئیں۔ جس کی بنیادی وجہ حد سے زیادہ تکلیفیں اور وہ تکلیفیں جن کا سامنا میں نے نہیں کیا بلکہ اس معاشرے میں موجود ہر اُس انسان نے کیا جو غریب تھا جس کے پاس تین وقت

پیٹ بھرنے کو کھانا نہیں تھا، روزگار کی تلاش میں دن رات کی پروا کئے بغیر در بدر بھٹکتے ہوئے ایک مجبور اور لاچار باپ نے جس اذیت کا سامنا کیا اُس باپ کی اذیت کو بیان کرتے ہوئے اچھا خاصا انسان کمزور پڑ جاتا ہے۔ یہ تو غربت کی ایک معمولی سی مثال ہے لیکن اُس غریبی کا کیا کیا جائے؟ جو ہماری اپنی پیدا کردہ ہے۔ جس کے قصور وار دراصل ہم خود ہیں۔

ناانصافی، حسد اس کا ذکر میں نے اپنے اکثر کالموں میں کیا ہے کیوں کہ یہ کہنے کو دو لفظ نہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ ان دونوں لفظوں نے مجھے ہر اُس انسان کی شناخت کروائی۔ جو مطلب پرست تھا۔ جس کے ظاہر اور باطن میں تضاد تھا۔ مجھے خود بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں کیا لکھ رہی ہوں؟ خواہ میں نے جن لفظوں کا استعمال کیا وہ درست بھی ہیں یا غلط؟ لیکن میں اتنا ضرور جانتی تھی میں جو بھی لکھ رہی ہوں وہ فضول نہیں، میرا لکھا ہوا ہر لفظ اس معاشرے میں موجود ہر اُس انسان کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے جو مظلوم ہے۔

میری دلی خواہش تھی کہ میں شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کی خدمات کے حوالے سے کچھ کام کروں لیکن چند ایسے واقعات رونما ہوئے

جنہوں نے میرے ضمیر کو جھنجھوڑا اور مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ میں کچھ ایسا لکھوں جو لوگوں کی اصلاح کا ضامن ہو۔ جو ہر مجبور انسان کے دل کی آواز ہو۔ مظلوم کی آواز بننے کے پیچھے میرا مقصد ہرگز کسی ادارے یا سیاستدان کی ساکھ کو متاثر کرنا نہیں بلکہ اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے سچ اور حق کے بول کو بالا کرنا ہے کسی کی ذاتیات پر کیچڑ اُچھالنا نہیں۔

آخر میں مَیں اپنی عزیز دوستوں کے تعاون کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ جنہوں نے کبھی بھی میری ہمت کو ڈگمگانے نہیں دیا، ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا اور میرے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی رہیں۔ میں اپنے سب چاہنے والوں کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

حمیرا جمیل

26-01-2018

حادثہ

زندگی حادثات سے بھری ہوئی ہے کب کوئی حادثہ پیش آ جائے؟ اور اس حادثے کے نتیجے میں انسان کی جان چلی جائے۔ لیکن حادثات زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ مگر ان حادثات کا کیا کیا جائے؟ جو حادثے نہیں ہوتے بلکہ ان کو حادثے کی شکل دے دی جاتی ہے۔ یہ وہ حادثے ہوتے ہیں جن کو چھپایا تو جا سکتا ہے لیکن اُن سے منہ نہیں موڑا جا سکتا اور حقیقت سے کب تک روگردانی کی جا سکتی ہے؟

ہم سب واقف ہے کہ آج بھی کوئی ظلم کے خلاف آواز بلند نہیں کرتا اگر کسی کو سرِ عام بازار میں پیٹا جا رہا ہوں تو ہم تماشا دیکھتے ہیں اور توبہ توبہ کرتے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ کسی کی جان بچانے کا سوچتے بھی نہیں ہم اس قدر مفاد پرست ہو گئے ہیں اور اگر کبھی مظلوم کا ساتھ دینا بھی پڑ جائے تو ہم اپنا پلو جھاڑتے ہوئے یہ

ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ تو حادثہ تھا اُس کی قسمت میں ایسے ہی مرنا لکھا تھا۔

اس طرح کے بیچ بازار قتل کو حادثہ قرار دینا ظلم کرنے والے کے گناہ میں شریک ہونے کے برابر ہے۔ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی ہم خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔

یہ تو ظلم کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔لیکن وہ اندوہناک ظلم جس کو حادثہ بنا دیا جاتا ہے اُس کو بیان کرتے ہوئے شرم سے ڈوب مرنے کو دل چاہتا ہے آخر انسان اتنا خودغرض اور بےحس کیسے ہوسکتا ہے؟ اسلام کو ماننے والے اور ایک ہی دین کے پیروکار غیرت کے نام پر قتل کی جانے والی لڑکی کا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟ اُس کے حقوق کی پاسداری کے لئے بغاوت کیوں نہیں کرتے؟

جدید دور میں رہنے کے باوجود بھی ہم اپنی سوچ کو نہیں بدل پائے۔ ہم سوچتے ہیں کہ گھر میں رہنے والی عورت کو روٹی، کپڑا میسر ہے تو اور کیا چاہیے؟ ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے یہی سب تو ضروری ہوتا ہے۔

ایک عورت کیا سوچتی ہے؟ وہ کیا چاہتی ہے؟ یہ کبھی کوئی نہیں

سوچتا کبھی معاشرہ اس پر پابندیاں عائد کرتا ہے تو کبھی گھر میں رہنے والے فرد اور شادی کے بعد اس کا شوہر جو اپنی بیوی پر سوچنے تک کی پابندی عائد کردیتا ہے۔ ہر سال پاکستانی عوام خواتین کا عالمی دن مناتی اور خواتین کو ان کے بنیادی حقوق دلانے کا عزم کرتی ہے جس میں تعلیم سرفہرست ہوتی ہے۔

اگر خواتین کا عالمی دن منانے اور خواتین کے حقوق کی بات کرنے کے بجائے ایک معصوم زندہ جلائی جانے والی لڑکی کے قاتلوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے تگ و دو کی جائے تو اس قسم کے عالمی دن منانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ جہاں ہم عورت کے حقوق کی بات کرتے ہیں تو پھر عورت سے اُس کا بنیادی حق نکاح نامے پر عورت کے حقوق کے کالم کو کاٹ کر کیوں چھین لیا جاتا ہے؟ میں نے اپنی ہمت جوڑتے ہوئے اس مسئلے پر بہت سے لوگوں سے بات بھی کی لیکن ہر ایک نے اپنی رائے کا تو اظہار کیا مگر ہر ایک کی رائے اس کی سوچ کی متقاضی تھی۔ آخر مجھے ایک مولوی حضرت سے اس کا جواب ملا۔ جن کا کہنا تھا کہ عورت فطری پور پر جذباتی ہوتی ہے اس لیے نکاح نامے سے عورت کے حقوق والے کالم کو لائن لگا کر ختم کردیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کیا ہر عورت جذباتی ہوتی ہے؟

اگر عورت اتنی ہی جذباتی ہے تو وہ اپنے شوہر سے مار کھانے کے باوجود بھی اُسی کے گھر میں رہنے کے بجائے طلاق لے کر چلی جائے۔ دراصل ہماری سوچ نے ہمیں اندھیرے میں دھکیل دیا ہے ہم نا چاہتے ہوئے بھی لکیر کے فقیر بن گئے ہیں۔ ہم نے خود سے فیصلہ لینا ہی چھوڑ دیا ہے بلکہ ہم تو معاشرے کے پرانے رسم و رواج کو تقویت دینے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔

جس کی عمدہ مثال یہ ہے کہ اگر کوئی بھائی اپنی بہن کو یا باپ اپنی بیٹی کو غیرت کے نام پر قتل بھی کر دے تو ہم قتل کو معمولی سی بات سمجھ کر یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے حادثات تو رونما ہوتے رہتے ہیں بدقسمتی کہ ہم قتل کو قتل نہیں بلکہ حادثہ سمجھ کر بھول جاتے ہیں اور رُعب دار لہجے میں کہتے ہیں عزت کو محفوظ بنانے کے لیے اس طرح کے حادثات کو اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ ہم مسلمان اور اسلام کے نام لیوا تو بن گئے لیکن کوئی بھی مذہب کسی بھی انسان کے قتل کی اجازت نہیں دیتا اور اسلام تو کسی کو ناحق قتل کرنے کے سختی سے منافی ہے تو پھر ہم کس مذہب کے ماننے والے ہیں؟ ہم صرف اپنی جھوٹی انا کی بنا پر قتل جیسے سنگین جرم سے بھی نہیں ڈرتے اور اپنا جرم چھپانے کے لیے قتل کو بھی حادثہ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

ٹیکس

امی بل آیا ہے کس چیز کا بل؟ ابھی تو چند روز پہلے بجلی اور گیس کا بل جمع کروایا تھا اب پھر بل آ گیا۔ امی یہ گھر کے ٹیکس کا بل ہے۔

اللہ اللہ اب گھر میں رہنے کا بھی ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔ کھانے کے لالے پڑے ہیں اور سونے پر سہاگہ ٹیکس بھی آ گیا صرف یہی کمی رہ گئی تھی۔ امی پانی کا بل بھی آیا ہے۔ کیا، تو ایسا کر گھر کو تالہ لگا تاکہ نہر میں ڈوب کر مر جائیں کم از کم ڈوبنے کا بل تو ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ تقریباً ہر گھر کی یہی صورتِ حال ہے۔ پاکستان کی آدھی سے زیادہ عوام کو تین وقت کی روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی۔ بھوکا رہنے کی وجہ سے ہر سال درجنوں لوگ زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں۔

ہمارے حکمران شاید رات کو شیخ چلی کے خواب دیکھ کر سوتے ہیں اس لیے اُن کو پاکستان امیر ملک دکھائی دیتا ہے۔ اگر نواز شریف سے

سوال کیا جائے کہ پاکستان میں ہر چیز خریدنے سے پہلے اُس کا ٹیکس دینا پڑتا ہے تو کیا یہ سراسر زیادتی نہیں؟ محترم نواز شریف کا جواب سن کر ہنسنے کو دل چاہتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں ماشاء اللہ پاکستانی عوام بہت امیر ہے اور یہ معمولی سے ٹیکس تو ہر انسان ادا کرتا ہے میں بھی ہر مہینے ٹیکس دیتا ہوں۔ دس کروڑ روپے کی گھڑی پہننے والے وزیراعظم کو کیا معلوم کہ آلو کتنے روپے کلو ہیں؟ اور تقریباً سبھی سیاست دان جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر اسمبلیوں میں جاتے ہیں وہ عوام کے مسائل کی نہیں بلکہ اپنے مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عمران خان جو اپنے جلسوں میں کرپشن کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے بقول پاکستان کرپشن زدہ ہو گیا ہے۔ ہر فیلڈ میں کرپشن ہو رہی ہے۔ میرا خان صاحب کو معصومانہ مشورہ ہے کہ کرپشن تو تب ہوگی جب لوگوں کو روزگار میسر ہوگا۔

بنی گالہ کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہونے والے سیاست دان کو کون بتائے کہ پاکستان کرپشن زدہ نہیں بلکہ ٹیکس زدہ ہو گیا ہے۔ اگر قومی اسمبلی میں موجود ہر ایک رکن کے اثاثوں کا جائزہ لیا جائے تو میرے اندازے کے مطابق ایک دو کے علاوہ کوئی ٹیکس نہیں دیتا ہوگا۔ کیوں کہ حکمران ٹیکس دینے سے بری ہے۔ میری یادداشت

کا قصور ہے یا پھر میں نے غلط سنا ہوگا ہمارے ایک مشہور سیاستدان جن کے مطابق میں سال بعد ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیکس بہت کم ہوتا ہے۔ میں اُن کا یہ بیان سن کر شش و پنج میں پڑ گئی کہ کیا یہ محترم سائیکل پر آتے ہیں یا پھر ان کے گھر بنیادی ضروریاتِ زندگی کی چیزیں نہیں خریدی جاتی۔ اور ٹیکس کی وہ رقم جو محترم ہر سال ادا کرتے ہیں وہ اتنی کم کہ سننے والے کا ذہن کام کرنا چھوڑ دے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ٹیکس کا قانون تو عوام کے لیے منظور کیا گیا ہے حکمران تو اس قانون سے بالاتر ہے۔

پی۔ ٹی۔ وی نیوز جو عوام کے پیسوں سے چلتا ہے۔ اس کا عوام کو کتنا فائدہ ہوتا ہے؟ غور کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ پی۔ ٹی۔ وی عوام کی نہیں بلکہ حکومتی نمائندوں کی آواز ہے۔ جہاں سب اچھا دکھایا جاتا ہے اور حکومت کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔

اگر ملکِ پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہے تو اس کا سہرا بھی عوام کے سر ہے۔ حکومتی وزیر احسن اقبال جنہوں نے حال ہی میں غیر ملک سے اپنا پیغام جاری کیا کہ پاکستان کی معیشت مستحکم ہے اور ڈی۔ جی۔ آئی ایس پی آر کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پاکستان کی معیشت

مضبوط نہیں۔

احسن اقبال یہ بیان پاکستان بھی آ کر دے سکتے تھے مگر کسی اور کے ملک میں بیٹھ کر اس طرح کی اختلافی باتیں کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ پاکستان کی معیشت مستحکم ہے اس بات پر یقین نہیں آتا پاکستان تو قرضوں کی زد میں ہے اور حکومت قرضوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ہر سال عوام پر ٹیکسوں کا بم گراتی ہے۔ جس سے بچنے کے لیے عوام بجلی کے کھمبوں پر چڑھ جاتی ہے یا پھر گورنر ہاؤس کے باہر دھرنا دے کر بیٹھ جاتی ہے۔

ڈاکٹر

پرنسپل صفیہ نہایت ملنسار اور نفیس خاتون ہیں۔ اُن سے میری ملاقات اتفاقاً اپنے گھر کے صحن میں ہوئی جب وہ میری امی کے ساتھ گفتگو کرنے میں محو تھیں۔ پرنسپل صاحبہ کو دیکھتے ہی میرے بڑھتے قدم پیچھے کی طرف مڑ گئے۔

کیا یہ وہی خاتون ہے؟ جن کی خوبصورتی کی میں بچپن میں فین ہوا کرتی تھی۔ خدا جانے وہ کس مشکل کا شکار تھیں؟ یا پھر کون سی تکلیف کا انہوں نے سامنا کیا تھا کہ ان کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور دل کش نظر آنے والی آنکھیں عینک کے پیچھے چھپ گئیں۔ میرا ذہن تذبذب کا شکار تھا۔ اچانک میرا ہاتھ پکڑ کر پرنسپل صفیہ نے مجھے اپنے ساتھ چارپائی پر بیٹھنے کا کہا۔ میں ٹکٹکی باندھے اُن کی جانب دیکھتی جا رہی تھی۔ آخر وہ جانے کے ارادے سے اُٹھی تو میں نے اُن

کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور پوچھا کہ آپ اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہے؟ کوئی پریشانی ہے۔

لیکن انہوں نے پھر بھی میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ لیکن میرے بار ہا اسرار کے بعد اُن کی آنکھ بھر آئی اور کہنے لگی میرا اکلوتا بیٹا احمر جس کی زندگی میری چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے چلی گئی۔ کاش میں اُس کو سرکاری ہسپتال نہ لے کر جاتی میں نے بہت منّتیں کی لیکن کسی سرکاری ڈاکٹر نے میری پکار نہ سنی میں کہتی رہی کہ میرے بیٹے کو دل کا دورہ پڑا ہے لیکن کسی نے میری فریاد نہ سنی اور میرے احمر کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ تمام ڈاکٹر حضرات کو صرف ہڑتال پر جانا تھا کیوں کہ اُن کی تنخواہ بہت کم تھی۔ میں نے اپنی ساری زندگی سرکاری خدمات میں وقف کر دی لیکن میرے مشکل وقت میں سرکار کے کسی بندے نے میرا ساتھ نہ دیا۔ بالآخر پرنسپل صفیہ دروازے کی طرف بڑھی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلی گئی۔

ڈاکٹر مسیحا ہوتا ہے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مریض کی جان بچاتا پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ تکلیف زدہ کو مرتا ہوا چھوڑ دے؟ یہ حقیقت ہے کہ میں جتنی بھی بیمار ہو جاؤں مجھے سرکاری ڈاکٹر کی دوائی سے کبھی آرام نہیں آتا مجھے آخر کار مہنگی فیس والے ڈاکٹر سے اپنا

چیک اپ کروانا پڑتا ہے تب میں ٹھیک ہوتی ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ مفت میں کوئی بھی آپ کا علاج نہیں کرتا اور سرکاری ڈاکٹر وہ تو حکومت سے مطالبات ہی پورے کرواتے نہیں تھکتے۔ ہر سال اُن کی کوئی نہ کوئی نئی سفارش ہوتی ہے جو حکومت کے پاس منظوری کے لیے پیش ہوتی ہے لیکن اگر کبھی وہ سفارش منظور نہ ہو تو ڈاکٹر حضرات اپنی ڈیوٹی کو چھوڑ کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور ہڑتالی کیمپ لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہسپتالوں میں صرف نرسیں موجود ہوتی ہیں جو ڈاکٹرز کی طرف سے پیغام رسانی کا فریضہ سرانجام دے رہی ہوتی ہیں اور کبھی دل چاہے تو بدتمیزی پر اُتر آتی ہے۔

ہڑتال کوئی ان سُنا لفظ نہیں ہر کوئی اس سے باخوبی واقف ہے۔ ہڑتالی کیمپ میں موجود ینگ ڈاکٹرز کی عجیب صورت حال ہوتی ہے اگر کوئی حکومتی رکن ان کی بات سننے نہ آئے تو وہ ہڑتالی کیمپ کو بھوک ہڑتالی کیمپ میں تبدیل کر دیتے ہیں اور اگر خدانخواستہ پھر بھی اُن کی جانب توجہ مرکوز نہ کی جائے تو وہ سڑکوں پر موجود گاڑیوں کے ٹائروں کو آگ لگا دیتے ہیں اور جلاؤ گھیراؤ شروع کر دیتے ہیں اور پولیس اگر ان سارے معاملات میں شامل ہو جائے تو پھر حالات کنٹرول نہیں ہوتے بلکہ مزید بگڑ جاتے ہیں۔ حالات کے خراب ہونے کی سب سے

بڑی وجہ یہ ہے کہ افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کرنے پر کوئی راضی نہیں
ہوتا۔ ہڑتال اور دھرنے میں زیادہ فرق نہیں ہڑتال دھرنے میں اُس
وقت تبدیل ہوتی ہے جب کشیدگی بہت زیادہ بڑھ جائے۔ 126 دن
کے دھرنے کو کون بھول سکتا ہے؟ جب الیکشن میں ہونے والی دھاندلی
کے نام پر دھرنا دیا گیا۔ یہ دھرنا ڈاکٹرز نے نہیں بلکہ مخالف جماعت
کے سربراہ نے حکومت کے خلاف دیا تھا۔ جہاں تک یہ غلط فہمی ہے کہ
دھرنا، ہڑتال اور احتجاج صرف اپوزیشن جماعت کا کام ہے تو یہ سراسر
غلط ہے اکثر اوقات حکومتی اراکین بھی اپنی تنخواہوں میں اضافے کی
غرض سے قومی اسمبلی کے باہر دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس لیے ہڑتال پاکستانی عوام کے لیے کوئی نیا لفظ نہیں۔ لیکن
ہڑتال اگر ینگ ڈاکٹرز کی ہو تو پولیس حالات کو قابو میں لانے کے
لیے ڈنڈوں کا اور آنسو گیس کی شیلنگ کا استعمال کرتی ہے اور کئی بار تو
ڈاکٹر حضرات کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے جس سے
صورت حال بہتر نہیں ہوتی بلکہ گھمبیر ہوتی ہے۔

غلطی پر غلطی

25 نومبر 2017ء کا خوشگوار دن، بادلوں کی اُوٹ میں چھپا آسمان
اور ہر لمحے کے ساتھ گزرتا ہوا وقت، گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک کی
آواز اور دن کے 12:30 بجے عجیب سا سناٹا جیسے کسی طوفان کی آمد
ہے لیکن پاکستان میں کب کیا ہو جائے کوئی بھی نہیں جانتا؟ وہ سناٹا
جس کو طوفان کی آمد سمجھا جا رہا تھا وہ طوفان نہیں بلکہ فیض آباد ٹول
پلازہ پر واقع مذہبی جماعتوں کا دھرنا تھا جس کو حکومتی جماعت نے
آپریشن کر کے ختم کرنے کا اعلان کیا۔ اب آپریشن کی بات کی جائے
تو یہ آپریشن سادہ نہیں تھا بلکہ اس آپریشن کے ذریعے دھرنے میں
شامل شرکاء پر گولیاں برسانے کا ارادہ کیا گیا۔ گولیاں بچوں کے
کھانے والی نہیں بلکہ وہ گولیاں جس سے ایک زندہ جیتا جاگتا انسان
موت کی نیند سو جاتا ہے۔ دھرنا پاکستان کی زینت ہے اگر یہ کہا جائے

تو غلط نہ ہوگا۔ اور دھرنے کی ابتداء کی بات کی جائے تو اس میں سب سے اہم کردار ہمیں پاکستان تحریک انصاف کا نظر آتا ہے۔ جس نے 126 دن اسلام آباد کی سڑک پر گزار کے یہ ثابت کیا کہ مطالبات منوانے کے لیے یہ سودا گھاٹے کا نہیں۔ لیکن اگر فیض آباد دھرنے کی بات کی جائے تو ہر ذی شعور انسان اس دھرنے کا حامی دکھائی دیتا ہے جس کی سب سے بڑی وجہ ختم نبوت پر پختہ یقین ہے۔ اسلام تو سچائی کا حامی مذہب ہے اور کسی بھی انسان کے ناجائز قتل کو جرم قرار دیتا ہے لیکن اگر قتل اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا ہو تو اس سے بڑھ کر تکلیف دہ امر اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے نہتی عوام پر شیلنگ ہوتے دیکھی اور سب سے بڑھ کر اُن کو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مرتے دیکھا۔ میرا دل زخمی ہے کیوں کہ جو ظلم اور بربریت کی انتہا کر رہے تھے وہ بھی پاکستانی تھے۔ پاکستان ایک پرامن ملک ہے۔ اب یہ جملہ صرف کتابوں تک یا بیانوں تک اچھا لگتا ہے۔ ٹی۔ وی چینلز، سوشل میڈیا کی بندش غیر ممالک کو واضح پیغام دیتی ہے کہ پاکستان میں ایمرجنسی نافذ ہو گئی ہے اور سکول، کالجز، یونیورسٹیاں بند کر کے تعطیلات کا اعلان کرنا اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ پاکستانی ریاست بہت کمزور ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ

کوئی بھی اُس وقت تک آپ کے گریبان پر ہاتھ نہیں ڈالتا جب تک آپ خود نازیبا الفاظ کا استعمال نہ کریں۔

ایک زخمی انسان کو مزید زخمی کرنا تباہی کی پہلی علامت ہوتی ہے اور یہ توقع کرنا کہ جس کو میں نے زخمی کیا ہے وہ تنہا ہے تو یہ دوسری بے وقوفی بالکل یہی سلوک حکومتِ وقت نے فیض آباد ٹول پلازے پر موجود دھرنے کے شرکاء سے کیا۔ جس کا نتیجہ حکومت کو مہنگا پڑا لیکن مہنگا تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ مسلم لیگ ن کے ایک غلط فیصلے نے حکومتی رٹ کو ملک سے ختم کر دیا جس کا ازالہ مسلم لیگ ن کو زاہد حامد وزیر قانون کا استعفیٰ قبول کر کے پورا کرنا پڑا۔ ایک چیز جس پر تحقیق کی ضرورت ہے وہ مسلم لیگ ن کی حکومت ہے کیوں کہ مسلم لیگ ن ہمیشہ اپنے غلط فیصلوں کی بدولت خسارے میں رہی ہے۔

اگر دھرنے کے شرکاء سے مذاکرات کر لیے جاتے تو شاید حالات نہ بگڑتے، شٹر ڈاؤن اور پہیہ جام ہڑتال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مسلم لیگ ن شروع دن سے غلطی پر غلطی کر رہی ہے۔ حکومت کا ہرگز یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ اپوزیشن جماعتوں کو گالیاں دے اور اُن کو نیچا دکھانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرے جب کہ مسلم لیگ ن نے تو یہ روش فطرتاً اپنائی ہوئی ہے کہ اگر کسی اپوزیشن جماعت نے حکومت کے

مخالف کوئی بیان داغ دیا ہے تو بھلا مسلم لیگ ن خاموش رہے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

حکومت کرنے کا بہترین اصول خاموشی اختیار کرنا ہے۔ خاموشی انسان کو بہت سی بلاؤں سے محفوظ بھی رکھتی ہے۔ اگر مثال دیکھنی ہو تو سب سے بڑی مثال ہمیں پیپلز پارٹی کی دکھائی دیتی ہے۔ آصف علی زرداری جنہوں نے سنی سب کی لیکن مرضی اپنی کی اور خوش اسلوبی سے پانچ سال حکومت پوری کی۔ خود بھی حکومتی پیسہ کھایا اور لوگوں کو بھی کھلایا۔ تاکہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ نواز شریف کی طرح غلطی پر غلطی نہیں کی، جنہوں نے اپنے تمام بہترین کاموں کو صرف ایک غلط فیصلے کی نذر کر دیا۔ مسلم لیگ ن میں صرف دو لوگ سمجھ دار دیکھنے کو ملتے ہیں ایک میاں شہباز شریف صاحب اور دوسرے چوہدری نثار جو غلطی پر غلطی نہیں کرتے۔

پاگل

یقین نہیں آتا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے ابھی تو یہ انسان بالکل ٹھیک تھا اچانک ایسا کیا ہوا کہ اس نے ہاتھ میں چھری پکڑ لی اور خود کو مارنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا شاید یہ میرے ذہن کا وہم ہے یہ صرف معاشرے کی نظر میں ہیرو بننے کی ایکٹنگ کر رہا ہے کاش یہ وہم ہی ہوتا مگر اُس نے پلک جھپکتے ہی اپنے بازو کی نبض کاٹ دی اور لوگ اردگرد کھڑے صرف تماشا دیکھتے رہے ہر ایک کی زبان سے صرف ایک ہی جملہ بار بار نکل رہا تھا پاگل نے اپنے بازو کی نبض کاٹ دی ہسپتال فون کرو تاکہ اس کو پاگل خانے داخل کروایا جا سکے۔ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں یہاں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی لوگوں کے دل احساسات سے خالی ہیں ہر کوئی ذرا سی بات پر دوسرے کو کاٹنے دوڑتا ہے۔

یوں جیسے صدیوں کی دشمنی ہوں۔ میں ہمیشہ ایک فقرہ دہراتی ہوں کہ تکلیف کے بعد ملنے والا زخم اتنا گہرا نہیں ہوتا لیکن اسے گہرا بنا دیا جاتا ہے۔ ہر انسان زندگی کو شاہانہ طرزِ زندگی سے گزارنا چاہتا ہے مگر سب کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی کچھ لوگ اپنی خواہشات کے حصول میں پاگل ہو جاتے ہیں۔

کوئی بھی پاگل یہ نہیں کہتا میں پاگل ہوں بلکہ اس کی حرکات یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ پاگل ہے۔ ایک ہنستا کھیلتا انسان پاگل خانے کی نذر ہو جاتا ہے۔ ہسپتال میں موجود وہ مریض جن کو پاگل قرار دیتے ہوئے پاگل خانے داخل کر دیا جاتا ہے میں اتنا ضرور جانتی ہوں وہ تمام پاگل نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ اپنے گھریلو ماحول سے تنگ آ کر سکون حاصل کرنے کی غرض سے پاگلوں کے ساتھ پاگل پن کا ناٹک کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

بجلی کا بل جس کو دیکھتے ہی اچھا بھلا انسان ذہنی مریض بن جاتا ہے۔ ہر مہینے آنے والے بل ہنستے کھیلتے انسان کو ذہنی مریض بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بیٹیاں رحمت سمجھی جاتی ہے مگر اُن کو زحمت بنانے میں معاشرے کا پہلو سب سے نمایاں ہوتا ہے۔ ہر باپ اپنی بیٹی کے روشن مستقبل کی دعا کرتا ہے لیکن اس باپ کو کیا معلوم؟

کہ درخشندہ مستقبل کی دعا کرنا صرف امیروں کے چونچلے ہیں۔ غریب تو صرف اُمید کر سکتا ہے۔ بیٹی کے پیدا ہونے پر دلی خوشی چند ایک کے سوا کسی کو نہیں ہوتی اگر کوئی خوش ہوتا ہے تو صرف دکھاوے کے لئے۔ جہیز کے نام پر فرمائشوں کا انبار لگانا جاہلانہ سوچ کی غمازی کرتا ہے جب ہمارے سوچ کے دریچے ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو ہم تنہا رہ جاتے ہیں ہماری یہ تنہائی ہمیں پاگل بنا دیتی ہے۔

پاگل انسان سے کسی بھی قسم کی توقع کی جا سکتی ہے اگر یہ بات ہے تو پھر اسے سکون سے مرنے کیوں نہیں دیا جاتا؟ کیوں اُس کی زندگی اُسی پر ہی تنگ کر دی جاتی ہے؟

سرکاری ملازم جو اپنی تنخواہ کو سوچ سمجھ کر خرچ کرتا ہے اُس کی سمجھ تب ختم ہو جاتی ہے جب اس کے گھر کی ضروریات تنخواہ سے تجاوز کر جاتی ہیں۔ پاگل ہونے کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وجہ خود بخود بن جاتی ہے۔ یہ وجہ کیا کم ہے کہ آپ کے اپنے دوست آپ کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں۔ جس معاشرے میں ہم زندگی گزار رہے ہیں وہاں موجود ہر انسان پاگل ہے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر لڑائی کرنا، کسی دوسرے سے حسد کرنا اور کسی کی کامیابی ہضم نہ ہونا ہر وقت یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جانا وہ کس طرح مجھے پیچھے چھوڑ

کر کامیاب ہو گیا؟ ذہنی مریض بننے کی ایک بڑی وجہ آپ کا گھر بھی
ہوتا ہے۔ اگر گھر کا ماحول سکون بخش ہو تو آدھی عوام ذہنی مریض بننے
سے بچ جائے۔ جب انسان کا ذہن تھک جاتا ہے تو وہ اُلٹی سیدھی
باتیں کرتا ہے اور اپنے ہوش و ہواس کھو بیٹھتا ہے اس صورت حال
میں لوگ اس کو پاگل تصور کرتے ہیں۔ میری دوستیں مجھے پاگل کہتی
ہیں شاید وہ ٹھیک کہتی ہیں جو میں سوچتی اور دیکھتی ہوں وہ اُس کو سمجھ
نہیں سکتیں اگر زندگی کا نام کھانا پینا اور مہنگے کپڑے خرید کر پہننا ہے تو
میں ایسی زندگی پر لعنت بھیجتی ہوں کسی فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے
انسان کی دکھ بھری کہانی سننے کا خیال کبھی ہمارے ذہن میں نہیں آیا
کہ خواہ وہ کس وجہ سے سڑک کنارے سونے پر مجبور ہے؟ مجھے یقین
ہے سڑک کنارے سونے والا ہر انسان نشے کا عادی نہیں ہوتا۔ ہم
دراصل بے حس اور خود غرض ہو چکے ہیں۔ اللہ نے انسان کو اتنا کمزور
نہیں بنایا کہ وہ دوسرے انسان کی تکلیف کو ختم کرنے کے بجائے اس
کے ساتھ رونا شروع کر دے۔ اگر اپنی ذات پر کسی دوسرے انسان
کی ذات کو فوقیت دینے کا نام پاگل پن ہے تو ہاں میں پاگل ہوں۔
مجھے پاگل کہلانے میں ذرا بھی شرمندگی نہیں۔

احساس

میں نے دیکھا ہے سڑک کنارے پھٹے پرانے، بدبودار کپڑے
پہنے ہوئے اُس حقیقت کو جو ملکِ پاکستان کی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی
کا ضامن تصور کی جاتی ہے۔ وہ حقیقت جس کو ہم ہر روز اپنی نظروں
سے دیکھتے تو ہیں لیکن دیکھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شاید ہماری
ترجیحات بدل گئی ہیں یا ہمارے دل انسانی جذبات اور احساس سے
خالی ہو چکے ہیں۔ اگر پاکستانی عوام سے یہ سوال پوچھا جائے کہ
حقیقت کیا ہوتی ہے؟ تو ہر ایک کی تعریف حقیقت کے متعلق مختلف ہو
گئی کیوں کہ ہر ایک کی بیان کردہ تعریف اُس کی سوچ کی غماز ہو گئی۔
مزدور یہ وہ غریب طبقہ ہے جس کو میں روزانہ سڑک کنارے کھڑا
پریشان دیکھتی ہوں۔ مجھے پہلے تو ان کو دیکھ کر دل ہی دل میں گمان
ہوتا کہ شاید یہ کسی بس کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور جب بس آ جاتی

ہے تو ان کا انتظار ختم ہو جاتا اور یہ اپنے کاموں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ شاید میرا گمان درست ہوتا لیکن میں غلط تھی، ایک دن دو دن، تین دن آخر کب تک میرا ذہن حقیقت سے دور رہتا۔ اچانک موٹر سائیکل والا آدمی آتا اور وہ موٹر سائیکل کو مناسب جگہ پر کھڑا کر کے خود نیچے اُترتا اور باری باری ہر ایک انسان کا انٹرویو لیتا ہر کوئی اس انتظار میں کھڑا رہتا کہ میری باری کب آئے گی؟

اس انٹرویو کا ہرگز مطلب کسی مستقل نوکری کے لئے امیدوار کی تلاش نہیں تھا بلکہ یہ انٹرویو تو اُس مزدور کا لیا جا رہا تھا جس کو ایک دن کی دہاڑی پر اینٹیں، سیمنٹ، بجری اور ریت اٹھانے کے لئے منتخب کیا جانا تھا۔ ہر وئی ایک دوسرے کو محنتی ثابت کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ آخر کار ایک مزدور انٹرویو میں پاس ہو جاتا ہے تو موٹر سائیکل والا اسے اپنے پیچھے بٹھا کر لے جاتا ہے۔

جو انٹرویو میں دیئے گئے سوالات کے جوابات دینے میں ناکام رہتے ہیں وہ بے چارے نہایت افسردگی کے عالم میں ایک دوسرے کے منہ کو تکتے رہتے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ آج کا دن ہمارے بچے بھوکے نہیں سوئے گئے لیکن اگر یہ امید ہوتی تو شاید اتنی تکلیف دہ نہ ہوتی مگر یہ حقیقت تھی وہ حقیقت جس کا سامنا کرنا کسی اذیت سے کم

نہیں تھا۔

مزدور جس کی روزانہ کی تنخواہ آٹھ سو یا ہزار سے زیادہ نہ ہو گی لیکن پھر بھی وہ اس قدر مقروض ہے اور مقروض صرف پیٹ بھرنے کے لیے کہ کہیں نہ کہیں سے مجھے اور میرے بچوں کو تین وقت کی روٹی کھانے کو مل جائے۔ مجھے یاد ہے اپنے ملک کے حکمران وہ حکمران جن کے پیٹ بھرنے کے لیے ہزارہا کھانے بنائے جاتے ہیں۔مگر ان حکمرانوں سے اگر آٹے، دال کا بھاؤ معلوم کیا جائے تو سوائے لاجوابی کے کچھ نہ ملے۔ کیوں کہ محلات میں رہنے والوں کا یہ مسئلہ نہیں۔ مسئلہ تو پاکستانی عوام کا اور اُس عوام کا ہے جو غربت کی لکیر سے حد درجہ نیچے گر گئی ہے۔ اگر بات صرف پیسے کمانے کی ہو تو وہ بھکاری بھی بھیک مانگ کر پیسے کما لیتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بھکاریوں کی عزتِ نفس مانگنے سے مجروح نہیں ہوتی۔ لیکن ایک عزت دار انسان سڑکوں پر بھیک مانگنے کے بجائے بھوک سے مرنا پسند کرتا ہے کیوں کہ عزت دار کو اپنی عزت زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

گرمیوں کی دوپہر تپتی دھوپ، جس سے ہر ماں اپنے بچے کو بچاتی ہے لیکن تپتی دھوپ میں سیمنٹ اور ریت اُٹھانے والے بھی کسی کے بچے ہوتے ہیں مگر بات صرف احساس کی ہے۔ ہمیں اپنے بچے زیادہ

عزیز ہے اس لیے کہ وہ ہمارے بچے ہیں محنت مزدوری کرنے والے تو شاید کسی غیر ملک سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہم ان کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ حالاں کہ وہ بھی ملکِ پاکستان کے باشندے ہی ہوتے ہیں لیکن ہماری ان سے کوئی ذاتی وابستگی نہیں ہوتی اس لیے ہم ان سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔

ذاتی وابستگی، سروکار کیا کسی کے دکھ اور تکلیف میں شامل ہونے کے لیے یہ دو چیزیں ضروری ہیں؟ ہاں ضروری ہے اس کا جواب اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ یہ دنیا مطلب کی ہے؟ اور مطلبی لوگ صرف اور صرف اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر تعلق قائم کرتے ہیں اور اس تعلق میں کسی دن رات محنت کرنے والے کا نام کیسے شامل ہوسکتا ہے؟ اور خاص طور پر اس محنت کرنے والا جو مزدور ہو اور جس کی اُجرت بامشکل چودہ پندرہ ہزار سے زیادہ نہ ہو۔ وہ مزدور جو اپنے خون کو پسینے کی طرح بہاتا ہوں اور پھر بھی ہمارا بے حس اور جذبات سے لاتعلق معاشرہ جس میں پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب افراد شامل ہیں اُس کو ان پڑھ اور غریب ہونے کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ اسے نازیبا الفاظ سے مخاطب کریں تو اس سے بڑھ کر افسوس ناک بات اور کیا ہوسکتی ہے؟

شاعری

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی شاعری کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال کی شاعری ہمیں رومانوی، انقلابی، معاشی سوچ کی علمبردار نظر آتی ہے۔ مفکرِ پاکستان نے اپنی شاعری ہی کے ذریعے نوجوان نسل کو جدوجہد کا پیغام دیا۔ عہدِ حاضر میں بھی ہمیں اقبال کی شاعری عہدِ قدیم کی طرح مقبول دکھائی دیتی ہے۔ اگر فیض احمد فیض کی شاعری کی بات کی جائے تو ہمیں واضح نظر آتا ہے کہ فیض جیسے شاعر نے بھی رومانوی شاعری کے برعکس انقلابی اور اصلاحی شاعری کا انتخاب کیا۔ حبیب جالب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جالب جیسا شاعر مدتوں بعد پیدا ہوتا ہے۔ حبیب جالب تو وہ شاعر تھا جس نے آمریت کے دور میں کوڑے کھائے۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کے جرم میں جیل کی سختیاں برداشت کیں مگر اپنے حوصلے کو کبھی

پست نہ ہونے دیا۔ اس لیے جالب کی شاعری ہمیں ہر دور میں زندہ و جاوید نظر آتی ہے۔

شاعری کا ذکر کرتے ہوئے میں نئے اُبھرنے والے شعراء کو کیسے نظر انداز کرسکتی ہوں؟ جنھوں نے اپنی شاعری کے موضوعات کو ہجر و وصال، سوز گداز، اور عشق و عاشقی جیسے پھٹے گھسے موضوعات اور محبت میں ملنے والی ذلت و رُسوائی تک محدود کر لیا ہے۔ اتفاقاً ہمارے ملک میں ہر کوئی شاعر بن بیٹھا ہے۔ اگر کسی محبت کرنے والے کی محبوبہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تو وہ اپنی محبوبہ کی جدائی میں شاعر بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ عہد کی شاعری صرف اور صرف انفرادیت کا پرچار کرتی نظر آتی ہے۔ ہر شاعر اپنے دُکھ کی کہانی اپنی شاعری میں پیش کر رہا ہوتا ہے۔ یقیناً اسے اپنی تکلیف کو بیان کرنے کے لیے سب سے بہترین پلیٹ فارم شاعری کا دکھائی دیتا ہے۔

بلاشبہ شاعر بھی ملک کی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرتے ہیں لیکن کیا کبھی ہمارے نوجوان شعراء نے خود سے سوال کیا یا پھر خود کا احتساب کیا کہ کیا ہماری شاعری نے لوگوں کو حرکت کا پیغام دیا اور کیا ہماری شاعری نے اخلاقیات کے تقاضوں کو پورا کیا؟

تو ان سوالوں کا جواب یہ ضرور دیا جا سکتا ہے کہ ہماری موجودہ

شاعری اس قابل نہیں کہ اُس کو پڑھا جائے اگر کوئی پڑھتا بھی ہے تو وقت گزارنے کے لیے لیکن اگر ہماری نوجوان نسل کی شاعری ملکی حالات، معاشی حالات، معاشرتی حالات اور مثبت تبدیلی کی عکاسی کرتی ہو تو ہم کبھی بھی اپنے نئے شعراء کی سوچ سے اختلاف نہ کریں۔

ہر عمدہ کام کرنے میں محنت درکار ہوتی ہے اسی طرح جب ہم شاعری کرنے میں محنت کرتے ہی ہیں تو کیا بہتر نہیں کہ ہم بھرپور محنت کرتے ہوئے ایسی شاعری عوام تک پہنچائے جو جمود کو توڑنے کا سبب بنے، جو اصلاح کا پیش خیمہ ثابت ہو اور جو ہماری قوم کو بہتر سفر کی جانب گامزن کریں۔

جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں وہاں ہمیں ہر دن نئی سے نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لیے قدم قدم پر راہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے اور راہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے والے کو راہنما تصور کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی کہ اب اصلاح کرنے والے لوگ بھی اس دنیا سے ناپید ہو گئے ہیں اگر کسی میں اصلاح کا جذبہ بیدار بھی ہوتا تو پلک جھپکتے ہی وہ جذبہ غائب بھی ہو جاتا ہے۔

خود غرضی کہیں یا پھر معاشرے کی ستم ظریفی کہ کوئی ہماری راہنمائی

اور اصلاح کیوں کریں؟ ہم خود ہی تو اپنے دشمن بن گئے ہیں دشمن
باہر سے تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تبدیلی کے نعرے عموماً
ہمیں ہر جلسے میں سننے کو ملتے ہیں لیکن اصل تبدیلی تو تب رونما ہوتی
ہے جب ہر شہری خواہ وہ کسی بھی شعبہ زندگی سے تعلق رکھتا ہو پہلے خود
کا جائزہ لیں۔ حقیقتاً ایک شاعر بھی تب عوامی شاعر کہلاتا جب وہ خود
اپنا جائزہ لیتا ہے اور اپنی ذات میں پیدا ہونے والی مثبت تبدیلیوں کو
خاطر میں لیتا ہے۔ اگر صرف اور صرف شعراء ملک کے روشن مستقبل کو
ذہن میں رکھ کر شاعری کریں اور ہر بار یہ کہہ کر بات نہ ڈال دیں کہ
شاعری کرنے والے کو تو خود بھی معلوم نہیں ہوتا وہ کیا لکھ رہا ہے؟ اور
شاعری تو خدا کی دین ہے۔ استفسار اور خود کو بہترین ثابت کرنے کی
ضد تو ہمارے ملک میں صدیوں سے رائج ہے۔ جس کا انعام ہم ہر
روز وصول کرتے ہیں۔ انعام پیسوں کی شکل میں ہوتا ہے یا پھر
اصلاح کی شکل میں یہ لینے والا خوب جانتا ہے۔

سیاست

وقت کب بدل جائے؟ کوئی بھی نہیں جانتا۔ دن کا رات میں اور
رات کا دن میں تبدیل ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اسی طرح انسانوں
کے رویوں میں جب تبدیلی محسوس ہوتی ہے تو ہم اس تبدیلی کو وقت کا
تقاضا نہیں کہتے بلکہ یہ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش
کرتے ہیں کہ مطلبی تھا جب کام نکل گیا تو رویہ ہی بدل گیا۔ اکثر لوگ
رویے میں پیدا ہونے والی تبدیلی کو سیاست کا نام دیتے ہیں اُن کے
بقول ہمارا دوست بہت لالچی تھا۔ سیاسی لوگوں کے ساتھ وقت
گزارنے کی بدولت ہم سے منہ موڑ گیا۔

سیاست جس کی بازگشت ہر گلی میں سنائی دیتی ہے۔ اگر بیٹا اپنے
باپ سے جائیداد کے حصول کی بات کرے تو اس کا باپ پہلے اپنے
بیٹے کی آنکھوں کو غور سے دیکھتا ہے جس کے بعد وہ اپنے بیٹے سے کہتا

ہے اچھو کل بات کریں گے۔ اچھو کل کی آس دل میں لگائے صبح ہونے کا انتظار کرتا ہے تاکہ اپنے باپ سے بات کر سکے مگر کل کا سورج تو پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو جاتا ہے مگر اچھو کا باپ اپنے بیٹے کو یہ کہہ کر گھر سے نکال دیتا ہے کہ تم میرے ساتھ سیاست کھیل رہے ہو تاکہ تم جائیداد کی وصولی کے بعد مجھے میرے ہی گھر سے بے دخل کر دو۔ سیاست عام سا لفظ ہے مگر پہلے سیاست صرف سیاسی میدانوں میں ہوتی دکھائی دیتی تھی مگر اب یہی سیاست ہر گھر کی زینت بن چکی ہے۔ اگر چاولوں میں تیل کی مقدار کم ہو تو ہمارے گھر کے بڑے بوڑھے یہ کہتے ہیں بہو تیل چاولوں میں ڈالنے کے بجائے اپنے میکے تو نہیں دے آتی۔ جس طرح پاکستان کے سیاستدان اپنی ساری دولت برطانیہ کے بینکوں میں جمع کروا دیتے ہیں بالکل اسی طرح تم بھی ہمارے ساتھ کوئی سیاسی بے ایمانی تو نہیں کر رہی۔

برطانیہ پاکستانی سیاست کا اہم مرکز جہاں ہمارے ملک کے حکمران اکٹھے ہو کر ساری دنیا کو اتفاقِ رائے کا پیغام دیتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ پاکستانی سیاست میں جس قدر بھی اختلافات ہوں مگر ملکی معاملات میں ہم سب ایک ہیں۔

پاکستانی سیاست ہر دن نیا ڈرامہ پیش کرتی نظر آتی ہے۔ اگر

حکومتی نمائندے مخالف جماعت کی کوئی فرمائش پوری نہ کریں تو مخالف جماعت اپنی فرمائش کو پاکستانی عوام کی آواز قرار دیتے ہوئے بھوک ہڑتالی کیمپ لگا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس سے مخالف جماعت کو دوگنا فائدہ حاصل ہوتا ہے ایک تو میڈیا کی کوریج مل جاتی ہے اور دوسرا وہ جماعت عوام کی نظر میں سیاسی مظلوم بن جاتی ہے۔ سیاست کو اگر ایک کاروبار سے تشبیہ دی جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ہمارے سیاست دان سیاست کی آڑ میں کاروبار ہی تو کرتے ہیں۔ الیکشن سے پہلے ووٹ مانگنے والے انسان کو اگر بغور دیکھا جائے تو وہ ایک متوسط گھرانے کا عام سا انسان نظر آتا ہے مگر حکومتی نمائندہ بنتے ہی ووٹ مانگنے والے میں اور حکومتی نمائندے میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے۔

ہمارے مقبول سیاست دان شیخ رشید صاحب جن کا ہر بیان میں اُن کے قد کو بلند کرتا ہے اور یقینا وہ منجھے ہوئے سیاست دان ہیں۔ پاکستانی سیاست میں کچھ ایسے سیاستدان بھی ہیں جن کا ذرا سا غلط بیان اُن کے سیاسی قد کو نیچے گرا دیتا ہے۔ میرے پسندیدہ کرکٹر عمران خان صاحب جو اب ایک سیاسی جماعت کے سربراہ ہیں اُن کے بارے میں مخالف جماعت یہی شکایت بار بار کرتی ہے کہ خان صاحب اپنی بات پر قائم نہیں رہتے ان کا حکومت کے بارے میں سیاسی موقف

روز بدلتا ہے۔ جس طرح موسم میں تبدیلی واقع ہوتی ہے بالکل ویسے
ہی خان صاحب کے بیان میں تبدیلی کی گنجائش موجود رہتی ہے۔

سیاست میں کبھی کبھار سیاستدان اخلاقیات کو بھول کر ایک
دوسرے کے گریبان بھی پکڑ لیتے ہیں اور نوبت بیچ بچاؤ تک پہنچ جاتی
ہے۔ مٹھائی میں موجود جلیبی جو بہت مزے کی ہوتی ہے منہ میں جاتے
ہی دل خوش کن احساس مہیا کرتی ہے اور زیادہ مہنگی بھی نہیں ہوتی اور
بہت سی بیماریوں کے علاج میں بھی مفید سمجھی جاتی ہے۔ مگر جب جلیبی کی
شکل کا معائنہ کیا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے بھول بھلیاں بنی ہوئی ہیں
اور گزرنے کا راستہ موجود ہی نہیں ہے۔ پاکستانی سیاست بھی جلیبی کی
طرح بہت مزے کی ہے آغاز میں ہر راستہ خوبصورت دکھائی دیتا ہے
مگر کچھ دن گزارنے کے بعد وہی راستہ جان کا دشمن بن جاتا ہے جس
سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔ اگر سوچا جائے تو سیاست کوئی خوفناک
چیز نہیں جس کو دیکھ کر بھاگ جائے۔

لیکن جب پاکستانی سیاست کی بات کی جائے تو واقعتاً سیاست
خوفناک دکھائی دیتی ہے جس کو دیکھ کر بھاگ جانے میں ہی بہتری
محسوس ہوتی ہے۔

ممکن ہے

پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان جنہوں نے حال
ہی میں سڑکوں پر دوبارہ نکلنے کا عندیہ دیا ہے۔ اُن کے بقول، مریم
نواز اور ان کے خاوند کیپٹن صفدر پر ابھی تک فردِ جرم کیوں عائد نہیں
ہوا؟ سپریم کورٹ کے باہر مسلم لیگ ن کے گلو بٹوں نے بدنظمی کا
مظاہرہ کیا جس کی بدولت جج صاحبان برہمی کا اظہار کرتے کمرہ
عدالت سے چلے گئے۔ وزیرخزانہ اسحاق ڈار جن کی سیاست چند روز
سے کالے بادلوں کی لپیٹ میں ہے اور ہمارے محترم وزیرخارجہ خواجہ
آصف جو پاکستان میں کم اور برطانیہ میں زیادہ دکھائی دیتے ہیں لیکن
میں غلطی پر ہوں کیونکہ حکومتی اراکین کی سیاست کا مرکز تو برطانیہ ہے
جہاں آج کل نواز شریف صاحب رہائش پذیر ہے نواز شریف کے
دیرینہ ساتھی چوہدری نثار جو عمران خان کے بھی دوست ہیں ان کی

نواز شریف سے ناراضگی چل رہی ہے جن کی ناراضگی حکومتی وزراء کے نزدیک موسمی ہے وہ جلد نواز شریف کے ہمراہ ہو گئے۔ مجھے ذاتی طور پر مسلم لیگ ن میں سے طلال چوہدری بہت پسند ہے اس کی وجہ مجھے خود بھی معلوم نہیں لیکن وہ کم از کم اپنی جماعت کا دفاع کرنے میں سب سے آگے تو کھڑے ہوتے ہیں تاکہ کوئی بلاوجہ مسلم لیگ ن پر تنقید کے نشتر نہ چلا سکے۔ وزیر اطلاعات و نشریات مریم اورنگزیب صاحبہ جو سیاست کی چاندنی ہے مجھے کئی دفعہ اپنے بیانات سے طلال چوہدری کی چھوٹی بہن معلوم ہوتی ہے۔ میری یاد کا محور پرویز رشید صاحب جو عمران خان کو دماغی مریض کہتے تھے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں میں ان کی تلاش میں ہوں لیکن وہ کسی بھی سیاسی ٹاک شو میں دکھائی نہیں دیتے مگر ممکن ہے کہ وہ بہت جلد سیاسی میدان کی زینت بنیں گے۔ آصف علی زرداری صاحب جو دبئی کی سرزمین سے اپنا پیغام جاری کرتے رہتے ہیں میرا چیئرمین بے نظیر کا بیٹا بلاول بھٹو ہے۔ یقیناً بلاول بھٹو، بھٹو خاندان کا چشم و چراغ ہیں۔

لیکن زرداری صاحب کو یہ کون سمجھائے کہ آپ کے چیئرمین کو اُردو زبان بولنی نہیں آتی اور اُن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ پیپلز پارٹی اب وہ جماعت نہیں رہی جس کے کارکن ہر صوبے میں

موجود تھے زرداری صاحب نے اپنی سیاست کو چمکانے کے لیے پیپلز پارٹی کو صرف سندھ تک محدود کر کے رکھ دیا اور خود دبئی کی سرزمین میں جا کر بیٹھ گئے۔

عمران خان جو تمام سیاسی جماعتوں کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں پہلے ہر دوسرے دن پریس کانفرنس کرتے دکھائی دیتے تھے لیکن اب کسی نیوز چینل پر دکھائی نہیں دیتے مجھے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بھی برطانیہ گئے ہوئے ہیں۔ پاکستانی سیاست میں سب ممکن ہے ایک دوسرے کے جانی دشمن کب بغل گیر ہو کر بھائی بن جائیں اس کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی؟ سیاست دان خاموش نہیں بیٹھ سکتے ایک دوسرے پر سیاسی وار کرتے رہتے ہیں۔ رانا ثناء اللہ وہ عمران خان کو ملک کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کے بیان پر خان صاحب کیسے چپ رہ سکتے ہیں؟ وہ نواز شریف کے ساتھیوں کو مراسی، پٹواری کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔

طاہر القادری جو عمران خان کے سیاسی کزن ہے وہ بھی وقتاً فوقتاً سڑکوں پر نکلنے کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ قادری صاحب کا مطالبہ جو وہ پیش کرتے رہتے ہیں ماڈل ٹاؤن قتل کیس کے مجرموں کو منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔ ماڈل ٹاؤن لاہور جہاں نہتی عوام کے خون سے

ہولی کھیلی گئی دن دیہاڑے بے قصور خواتین اور بچوں کو سرِ عام قتل کیا
گیا اور قتل کرنے والے غیر ملک کے لوگ نہیں تھے بلکہ پاکستانی عوام
کے محافظ پنجاب پولیس کے کارندے تھے لیکن اگر سوچا جائے تو پولیس
جان بوجھ کر شہریوں پر گولیاں نہیں برساتی جب تک ریاست کی
منظوری شامل نہ ہو اور صوبہ پنجاب کے سربراہ نواز شریف کے بھائی
شہباز شریف صاحب ہیں جو اس دل سوز سانحے کے بعد یہ کہتے ہوئے
نظر آئے کہ اگر میرا قصور نکلا تو میں خادمِ اعلیٰ کے عہدے سے استعفیٰ
دے دوں گا اور میں نے اس سارے واقعہ کی تحقیقات کے لئے کمیشن
بنا دیا ہے۔ کوئی پوچھے خادمِ اعلیٰ سے آپ کے وزیراعلیٰ ہونے تک
کیسے شفاف تحقیقات کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟

میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ شہباز شریف صاحب کو
ماڈل ٹاؤن کا واقعہ لے ڈوبے گا اور عنقریب آصف علی زرداری
صاحب بھی محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کیس میں جیل کی سلاخوں کے
پیچھے ہو گئے اور ممکن ہے کہ بہت جلد متحدہ قومی موومنٹ لندن کے
سربراہ الطاف حسین بھی پاکستان میں موجود ہوں کیوں کہ پاکستانی
سیاست دانوں کی پرواز کا رُخ کب کس طرف ہو یہ اندازہ لگانا
مشکل تو ہے؟ لیکن ناممکن نہیں۔

کھو گیا

مٹی کا بنایا ہوا انسان جس نے مرنے کے بعد بھی مٹی کے نیچے ہی
دفن ہونا ہے۔ مٹی کی خوشبو دل کو فرحت آمیز احساس بخشتی ہے۔ مٹی جو
لوگوں کے لیے محض عام سا نام ہے کوزہ گر اپنے فن سے مٹی کو وہ مقام
اور مرتبہ عطا کرتا ہے کہ انسانی عقل شش و پنج کا شکار ہو جاتی ہے۔
عطا کرنے والی تو اللہ کی ذات ہے لیکن اللہ نے ایک انسان کے
ہاتھوں میں وہ کمال چھپا کر رکھا ہے کہ دیکھنے والا سوچنے پر مجبور ہو
جاتا ہے کہ کیا واقعتاً یہ شاہکار بنانے والا انسان ہے۔ کمہار اپنے
ہاتھوں کی مہارت سے نہ صرف مٹی کے خوبصورت برتن بناتا ہے بلکہ
ان برتنوں کے خشک ہونے کا انتظار بھی کرتا ہے تاکہ وہ ان پر دل کو
لبھانے والی نقش و نگاری بھی کر سکے۔

کوئی خاص منظر جو اس کی نظر کے سامنے سے گزرتا ہے وہ اس

منظر کی تصویر کشی اس انداز میں کرتا ہے کہ دیکھنے والے کو یوں لگتا
ہے کہ جیسے وہ حقیقی طور پر اُس منظر کی سیر کر رہا ہے۔ کسی بھی کام
کرنے میں محنت درکار ہوتی ہے، لیکن جس قدر محنت ایک کمہار کرتا ہے
اپنا خون پسینہ بہا کر اپنی مہارت کا ثبوت پیش کرتا وہ یقینا خراجِ
تحسین کا حق دار ہے۔ بدقسمتی کہ اس کی محنت کی قیمت سو ڈیڑھ سو سے
زیادہ نہیں ہوتی اور قیمت ادا کرنے والا جس قدر نازونخرے دکھاتا
ہے وہ سب سے تشویش ناک بات ہے جیسے وہ کسی احسان کا بدلہ چکا
رہا ہوں۔

گرمی کی شدت کے احساس کو کم کرنے کے لیے لوگ ہاتھ کے
پنکھوں کا استعمال کرتے ہیں۔ مگر گرمی تو اُن کو بھی لگتی ہے جو یہ پنکھے
بناتے ہیں شاید ان کے یہ روزگار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ جس لاعلمی کے
ساتھ اپنے کام کو انجام تک پہنچاتے ہیں یہ وہی بہتر جانتے ہیں ننگے
بدن پھٹے کپڑے، پاؤں میں ٹوٹی چپل، پیاس کی شدت لیکن پھر بھی
پرسکون چہرے کے ساتھ اپنے کام میں مصروف، اتنی محنت کرنے کے
بعد جو یہ کماتے ہیں اس سے صرف تین وقت کی روٹی ہی بامشکل پوری
ہوسکتی ہے۔

چوڑیاں لے لو، سوہنی پیاری لال رنگ کی چوڑیاں، یہ آوازیں

اکثر ہمیں عید کے دنوں میں سننے کو ملتی ہیں اپنے سر پر بڑا سا ٹوکرا
اٹھائے چوڑیاں خریدنے کی دعوت دینے والی یہ عورت جس قدر مجبور
ہوتی اُس کی مجبوری اس کے چہرے سے عیاں ہو رہی ہوتی ہے چوں
کہ کسی کو سمجھنا آسان نہیں اس لیے وہ بے چاری محض روزانہ آواز
دے کر ہی چلی جاتی ہے کہ شاید آج مجھے چند پیسے مل جائیں لیکن اس
کو کیا معلوم؟ کہ لوگوں کی ترجیحات بدل گئی ہیں اب لوگ امیر ہو گئے
ہیں۔

کوڑا کرکٹ میں سے پلاسٹک کے شاپر اور کام کی چیزیں اکٹھی
کرنے والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ اور جسم بھی
دوسرے انسانوں کی طرح سکون کی توقع کرتے ہیں لیکن ان کی یہ
امید ان کی لاچاری اور غربت پر بازی لے جاتی ہے جس انداز سے
وہ کوڑا کرکٹ جس کو ہم لوگ گندگی کہتے ہیں چھوٹے چھوٹے بچے اپنے
تھکے ہوئے چہرے کے ساتھ جس نظر سے اُس کوڑے کو دیکھتے ہیں
اور اگر کوئی مہنگی چیز نظر آ جائے جس کو وہ بیچ کر بہت زیادہ پیسے وصول
کر سکیں تو وہ منظر ان کے لیے کسی عید سے کم نہیں ہوتا۔

جب وہ اپنے کام کی چیزیں کوڑے میں سے اکٹھی کر رہے ہوتے
ہیں تو ان پر کتے بھی بھونکتے ہیں، وہ ان کا ضبط ہے کہ وہ کس طرح

ان کتوں کی آوازوں کو برداشت کرتے ہیں؟ اور کبھی کبھی تو کتے ان کو کاٹ بھی دیتے ہیں لیکن یہ کہاں سے اتنا حوصلہ لاتے ہیں یہ چیز لمحہ فکریہ ہے؟ بھوک انسان سے سب کچھ کرواتی ہے لیکن یہ تو پھر محنت کی مزدوری ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں مگر ہمارے معاشرے کی ستم ظریفی کے ان لوگوں کو پھر بھی کمتر نظروں سے دیکھا جاتا ہے جیسے وہ اس ملک کے باشندے نہیں۔ کچھ لوگ تو محنت کی آڑ میں چوری چکاری کرتے ہیں پھر بھی وہ اچھے کہلائے جاتے ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ یہ کیا کم ہے؟ وہ امیر تو ہیں اُن کے پاس پیسہ تو ہے چاہے وہ پیسہ جس بھی ذریعے سے آیا ہو۔

لوگ آپ کی حیثیت دیکھ کر آپ سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ رشتہ داری کا معیار حیثیت پر مبنی ہوتا ہے۔ مزدوری کرنے والا بھی انسان ہے لیکن وہ محنت کرنے کے باوجود بھی کہیں کھو گیا ہے، اس کی مزدوری سے صرف اُس کے اہلِ خانہ کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اُس کے دوست احباب کی نہیں، اس لیے اُس کا معیار بہت چھوٹا ہے۔ وہ معاشرے کے تقاضوں کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے بہت دور کہیں کھو گیا ہے اگر وہ کہیں کھو گیا تو اُس کا کھو جانا ہی بہتر ہے کیوں کہ کم از کم کھو جانا اُس کی زندگی کے لئے تکلیف کا باعث تو نہیں۔

مجھے کیوں نکالا

نواز شریف بھی کمال کے انسان ہیں۔ وزیراعظم کا عہدہ چھننے کے بعد ہر جلسے میں یہ نعرہ لگاتے نظر آتے ہیں مجھے کیوں نکالا؟ میرا قصور کیا تھا؟ میں نے ملک کو ترقی کی راستے پر گامزن کیا اور ملکِ پاکستان میں سی پیک جیسے منصوبے کا آغاز کیا۔ نوجوان نسل کے لیے روزگار سکیم متعارف کروائی۔ پھر بھی میرے ساتھ ناروا رویہ برتا گیا۔ مجھے کیوں نکالا گیا؟ میرا قصور صرف یہ تھا کہ میری جماعت مسلم لیگ ن نے ہمیشہ عدلیہ کا احترام کیا ہے، عدلیہ کے فیصلوں کو سر جھکا کر تسلیم کیا ہے۔ جہاں میاں صاحب اپنے نکالے جانے کا سوال کرتے ہیں وہاں اس کا جواب بھی خود دیتے ہیں تاکہ عوام کو زیادہ محنت نہ کرنی پڑے نواز شریف بہت معصوم ہے حقیقت جانتے ہوئے بھی کہتے ہیں مجھے کیوں نکالا؟ نااہل ہونے کے بعد اس طرح کی بات کرنا آسان کام

نہیں۔

نواز شریف کے بیان پر مجھے کیوں نکالا؟ اپوزیشن بھلا کیسے خاموش رہ سکتی ہے؟ اپوزیشن لیڈر خورشید شاہ جن کے بقول میاں صاحب کو اس لیے وزیراعظم کے عہدے سے ہٹایا گیا کیوں کہ وہ کرپشن کے مرتکب قرار پائے۔ پی ٹی آئی سربراہ عمران خان نواز شریف کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں آپ رنگے ہاتھوں چوری کرتے پکڑے گئے ہیں۔ اس کے باوجود بھی یہ کہنا مجھے کیوں نکالا؟ یہ بیان پاکستان کے خلاف بغاوت ہے۔

کرسی کو چھوڑنا بہت ہی مشکل ہے اور کرسی بھی وہ جس پر بیٹھنے کی عادت ہو چکی ہوں۔ نواز شریف نے وزیراعظم کی کرسی حاصل کرنے کے لیے جس قدر تگ و دو کی تھی یہ وہی جانتے ہیں۔

اپوزیشن جماعتوں کے لیے گولڈن ٹائم ہے کیوں کہ نواز شریف وزیراعظم نہیں رہے لیکن اپوزیشن جماعتوں کے لیے خطرے کی گھنٹی موجود ہے جس سے وہ ناواقف ہے۔ سپریم کورٹ اگر نواز شریف کو نااہل کر سکتی ہے تو پھر خورشید شاہ عمران خان اور دیگر جماعتوں کے نمائندے بھی نااہل ہو سکتے ہیں کرپشن کے بادشاہ صرف میاں صاحب ہی نہیں بلکہ اس میدان میں سارے گندے ہیں کوئی بھی دودھ کا دُھلا

ہوا نہیں اور سیاست میں ہر چیز کی اُمید کی جا سکتی ہے کب کس کا عروج زوال میں بدل جائے؟

لیکن نواز شریف نے ایک اچھی مثال قائم کرتے ہوئے فراخ دلی کا ثبوت دیا اور عزت کے ساتھ وزیراعظم کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ اُن کے اس امر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

جنرل راحیل شریف جنہوں نے سیاسی بحث و مباحثے کے باوجود اپنی ریٹائرمنٹ کو سیاست کی نذر نہ ہونے دیا۔ بلکہ مدت پوری ہوتے ہی اپنی کمان جنرل قمر جاوید باجوہ کے سپرد کی اور لوگوں کی زبان پر کاری ضرب لگائی تاکہ فوج جیسے عظیم ادارے کے حوالے سے قیاس آرائیوں کا سلسلہ رُک جائے۔

جنرل پرویز مشرف جس کو کون بھول سکتا ہے؟ اقتدار کے لالچ میں مشرف نے پاکستان کی بھی پرواہ نہیں کی۔ مشرف کے دور میں بے نظیر کی شہادت کا سانحہ رونما ہوا۔ مشرف سے تو کرسی چھن گئی لیکن بے نظیر کا قاتل کون تھا کس نے محترمہ بے نظیر کو قتل کیا یہ معاملہ ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔ جنرل مشرف تو اپنی بیماری کا بہانہ بنا کر دبئی روانہ ہو گیا لیکن بے نظیر کے قاتلوں کو کسی نے تلاش کرنے کی کوشش نہ کی۔ کچھ دن پہلے پرویز مشرف نے دبئی سے وڈیو جاری کی جس میں انہوں نے

صاف صاف کہا کہ بے نظیر کی موت کا سب سے زیادہ فائدہ آصف علی زرداری کو ہوا۔ بے نظیر کے بھائیوں کے قتل کے پیچھے بھی زرداری کا ہاتھ تھا۔ آصف علی زرداری نے بے نظیر کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اقتدار حاصل کرنے کے لیے، اگر غور کیا جائے تو واقعتاً بے نظیر کی موت کا سب سے زیادہ فائدہ زرداری صاحب کو ہی ہوا تھا۔

مگر یہ معمہ بھی یقینا سیاست کی نذر ہو جائے گا۔ نواز شریف جو آج کل مجھے کیوں نکالا، مجھے کیوں نکالا؟ کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ حیرت ہے انہوں نے جنرل پرویز مشرف کے بیان پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ نواز شریف نے بے نظیر بھٹو کے ساتھ مل کر میثاقِ جمہوریت کے معاہدے پر دستخط کیے تھے لیکن اب نواز شریف محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھول چکے ہوں گے کیوں کہ وہ خود پریشانی سے دوچار ہے کہ مجھے کیوں وزیراعظم کے عہدے سے ہٹایا گیا؟

لندن

پاکستان کے نیوز چینلز پر ہر وقت بریکنگ نیوز کا بازار گرم رہتا ہے۔ نیوز چینل اپنی ریٹنگ بڑھانے کے چکروں میں ہر بار یہ راگ الاپتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ سب سے پہلے ہمارے ٹی وی چینل نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پٹرول کی قیمت سستی ہونے کی خبر عوام تک پہنچائی۔ پاکستان میں اچھی خبریں کم اور بُری خبریں زیادہ سننے کو ملتی ہیں اور اچھی خبر اگر بریکنگ نیوز کی صورت میں ملے تو ہنستے کھیلتے انسان کو دل کا دورہ پڑ سکتا ہے۔ گزشتہ روز بریکنگ نیوز سننے کو ملی کہ نااہل نواز شریف صاحب لندن روانہ ہو گئے ہیں اب وہ کبھی پاکستان واپس نہیں آئیں گے، اور لندن سے پارٹی امور کی صدارت کریں گے۔ اس نیوز کے بریک ہوتے ہی صحافی برادری حرکت میں آ گئی اور ہر نیوز چینل پر ایک ہی بات کا ڈھنڈورا پیٹا جانے لگا کہ مسلم

لیگ ن کا سیاسی مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے نواز شریف نے موجودہ سیاسی حالات سے راہِ فرار اختیار کر کے لندن میں ڈیرہ لگا لیا ہے۔

ابھی اس نیوز پر بحث ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک اور تازہ خبر موصول ہوئی کہ بیگم کلثوم نواز بھی لندن چلی گئی ہیں۔ نیوز چینلز پر صحافیوں کی بہار اُمڈ آئی تھی ہر کوئی اپنی اپنی رائے دینے میں مصروف تھا۔ اسی دوران مریم نواز کے ٹویٹ نے سب کے منہ بند کر دیئے کہ میری ماں بیمار ہے اپنی بیماری کے علاج کے لئے وہ لندن گئی ہیں۔ خیر اس ٹویٹ کے بعد کچھ سکون ہوا۔

لندن پاکستانی سیاست کا اہم مرکز ہے۔ جہاں پاکستانی سیاست دان اکٹھے ہو کر ملکی حالات کے حوالے سے اپنا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ غیر ملکوں کے سیاست دان لندن سیر و تفریح کے لئے آتے ہیں لیکن پاکستان کے سیاست دان اپنے نجی معاملات کو سلجھانے کی غرض سے سفرِ لندن کا رخ کرتے ہیں۔

نواز شریف کے نااہل ہونے کے بعد شریف فیملی نے لندن کی دل خوش کن فضاؤں کا رُخ کیا۔ ٹھنڈے خوشگوار موسم میں سیاسی گرما گرمی نے لندن کا موسم بے مزہ کر دیا۔ چوہدری نثار جن کے نواز شریف سے اختلافات چل رہے ہیں اُن کی لندن آمد نے بہت سے

سوالوں کو جنم دیا کہ چودھری نثار عمران خان سے ملنے جا رہے ہیں یا پھر نواز شریف سے۔ کیوں کہ لندن سے عمران خان صاحب کا بھی بڑا گہرا رشتہ ہے۔

خان صاحب بھی اپنے بیٹوں سے ملاقات کرنے کے لیے لندن کی اُڑان بھرتے ہیں۔ لندن کے ہسپتال بہت شفا بخش ہے اگر پاکستان میں کسی بیماری کا علاج میسر نہ ہو تو لندن روانہ ہونے کی نصیحت کی جاتی ہے۔

پاکستان کے مشہور سیاست دان ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین جن کی پارٹی لندن سے چلتی ہے وہ اپنے کارکنوں سے بذریعہ وڈیو لنک خطاب کرتے ہیں اور کارکن الطاف بھائی کے لیے تن، من، دھن کی بازی لگانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

الطاف حسین لندن میں بیٹھ کر ایک کال کرتے ہیں اور اُن کے پیغام پر عمل درآمد کرتے ہوئے متحدہ کے کارکن پورا سندھ بند کر دیتے ہیں ایم کیو ایم کو سندھ کی بڑی جماعت مانا جاتا تھا لیکن الطاف حسین نے اپنے غلط بیانات اور فیصلوں کی بدولت اپنی پارٹی کو کھو دیا ہے۔

اور اب الطاف حسین صرف لندن تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور ایم کیو ایم پاکستان کے نام سے فاروق ستار سیاسی پارٹی کی صدارت

کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر القادری جن کو اللہ نے بیش بہا علم عطا کیا ہے۔ قادری صاحب ظلم اور جبر کے خلاف آواز اٹھانے کی غرض سے پاکستان آئے لیکن طاہر القادری کو سوائے ذلت اور رسوائی کے کچھ نہ ملا۔ اور اُن کو کئی بار مایوس ہو کر لندن واپس جانا پڑا۔ سوات کی بیٹی ملالہ یوسف زئی جس کی بہادری کے چرچے ہر جگہ سننے کو ملتے ہیں۔ میرے ذہن میں ہمیشہ یہ بات کھٹکتی ہے کہ مس ملالہ نے کس ملک کو فتح کیا ہے صرف دہشت گردوں کے خلاف آواز ہی تو بلند کی تھی۔ اگر یہ بہادری ہے تو پھر میری ایک رائے ہیں کہ ہر لڑکی دہشت گردوں کے مقابل کھڑی ہو جائے تا کہ لندن تو جا سکے۔ کیوں کہ لندن میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ تو نہیں ہوتی وہاں غریب بچے بھوک کی وجہ سے روزانہ مرتے تو نہیں۔ اگر مس ملالہ نے ہمت کر کے دہشت گردوں کے خلاف آواز بلند کی تھی تو پھر بندوق کی گولی سے زخمی ہونے کے بعد اپنی فیملی کے ساتھ لندن کو پیاری نہ ہو جاتی بلکہ جواں مرادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپس اپنی سرزمین پاکستان آتی۔

اولاد

نرم اور حساس دل رکھنے والی ماں جس کے پاؤں تلے جنت کی نوید سنائی گئی۔ وہ ماں جس کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں ملتی اپنی جان پر ظلم برداشت کر کے اپنی اولاد کو سکون دینے والی۔ بلاشبہ اس ہستی کا نعم البدل تلاش کرنا ناممکن ہے۔ میری ماں دنیا کی حسین ماں ہے۔

یہ جملہ نہایت دلکش احساس مہیا کرتا ہے لیکن اگر یہ جملہ صرف جملے سے نکل کر حقیقت کا لبادہ اوڑھ لے تو کیا ہی اچھی بات ہو؟ ہر بیٹا اپنی ماں سے محبت کا اظہار کرتا ہے مگر کچھ بیٹے ایسے بھی ہوتے ہیں جو محض اپنی ماں سے کوئی نفع بخش فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے لالچی بیٹوں کو اللہ ہدایت دے۔

ایدھی ہوم جہاں ہوس کی ستائی اولاد اپنے والدین کو چھوڑ جاتی ہے اور والدین جس میں ماں کا کردار سرِ فہرست ہوتا ہے ہر دن اپنی

اولاد کا راستہ دیکھنے گزار دیتی ہے۔ شاید میرا لختِ جگر مجھ سے ملنے آ
جائے لیکن وہ دن کبھی نہیں آتا۔

مما میری خواہش ہے میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں اور آپ کو اور ابو کو
ایک بڑا سا گھر خرید کر دوں لیکن مجھے اس کے لیے بہت زیادہ رقم
چاہیے۔ ماں جو اپنے بیٹے کی خواہش کے پیشِ نظر اپنا زیور تک بیچ دیتی
ہے اور اگر ضرورت پڑے تو گھر بھی فروخت کر دیتی ہے تاکہ میرا بیٹا
پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن سکے۔ باپ کا درجہ بھی ماں سے کم نہیں باپ دن
رات محنت کر کے اپنے گھر کی کفالت کرتا ہے تاکہ میری اولاد چین کی
نیند سو سکے اور ایک خوشحال زندگی گزار سکے۔

اپنی اولاد کو پُرآسائش زندگی کی سہولتیں میسر کر کے والدین ناپختہ
عمارت کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ایسی عمارت جو کبھی بھی ٹوٹ سکتی ہے۔
لازمی نہیں کہ ہر بیٹا بیٹی اپنے والدین کی قدر کرے۔ ذرا سی بات پر
وہ اولاد جس کو ماں باپ پیدا کر کے بڑا کرتا ہے وہ بدقسمت اولاد یہ
کہنے سے بھی گریز نہیں کرتی کہ ابو صرف اور صرف آپ کی وجہ سے
میرے دوست میری بے عزتی کرتے ہیں اور آپ کے میلے کپڑے
دیکھ کر میری عزت میں کمی آتی لیکن یہ سب الفاظ استعمال کرتے
ہوئے اولاد یہ ضرور بھول جاتی ہے کہ مجھے آرام دہ زندگی مہیا کرنے

والے میرے والدین ہیں جن کی میں آج توہین کر رہا ہوں۔

اگر ہر ماں کو یہ معلوم ہو جائے کہ میری اولاد سے میرا فلاں بیٹا
دہشت گرد بنے گا تو وہ پیدا ہوتے ہی اُس کا گلا گھونٹ دے۔
دہشت گرد بھی ہم ہی میں سے لوگ بنتے ہیں وہ لوگ جن کو گھر میں
پیسوں کی قلت کا سامنا کرنا پڑے یا پھر تعلیم یافتہ دہشت گرد یہ وہ
دہشت گرد ہوتے ہیں جن کے پاس تعلیم تو ہوتی ہے مگر روزگار نہیں
اور اپنی بھوک سے تنگ آ کر یہ دہشت گردی کے شعبے کو اختیار کرتے
ہیں اگر ہمارے ملک میں روزگار ہو تو کوئی بھی مسلمان اپنے ہی
مسلمان بھائی کا قتل کر کے دہشت گرد نہ کہلائے۔

بدقسمتی اُن والدین کی جن کے گھر اس قسم کی اولاد پیدا ہو جاتی
ہے۔ ایسی اولاد ماں باپ کے لیے صرف ایک آزمائش ہوتی ہے۔
ایسی آزمائش جو عمر بھر والدین کے لیے ناسور ثابت ہوتی ہے۔

اگر ایدھی ہوم جیسے مرکز بھی پاکستان میں نہ ہوں تو وہ بے سہارا
ماں باب جن کی اولاد اُن کو لاوارثوں کی طرح سڑک پر چھوڑ دیتی
ہے کہ اللہ کرے یہ کسی گاڑی کے نیچے آ کر مر جائیں تاکہ کم از کم
ہماری جان تو ان سے چھوٹے اور ہم ایک اچھی زندگی گزار سکیں۔ ایسے
مراکز اس لعنت زدہ اولاد کے منہ پر طمانچہ ہے کہ ابھی بھی پاکستان

میں انسانیت ہے اور رشتے خون کے نہیں بلکہ احساس کے ہوتے ہیں جو پاکستان میں موجود ہیں۔

اولاد اللہ کی دین ہے لیکن اگر اولاد ہو تو نیک ہو ایسی اولاد سے بے اولاد ہونا بہتر ہے جو اپنے والدین کو اپنی بے عزتی، رسوائی، ذلت اور بے روزگاری کا ذمہ دار سمجھ کر روزانہ گندی گالیاں دے اور اپنے باپ کا گریبان پکڑنے سے بھی نہ گھبرائے۔

نکتہ چینی

سالن کچا ہے، سبزی بھی نہیں گلی، اور مرچ تو دل کھول کے ڈالی ہے۔ تمہیں تو کھانا بھی نہیں بنانا آتا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں شادی ہی نہ کرتا یہ چھوٹی موٹی نوک جھونک تو ہر گھر کا معمول ہوتی ہے۔ یقینا ہر خاوند اپنی بیوی کے ہاتھ کا مزے دار کھانا کھانے کا خواہش مند ہوتا ہے مگر کچھ خاوند تو دماغی مریض ہوتے ہیں کام سے آتے ہی نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں میز پر مٹی ہے، صوفہ بھی ٹھیک سے صاف نہیں ہوا۔ میں جانتا ہوں تم نے میرے کپڑے بھی استری نہیں کیے ہوں گے۔ ہر وقت نکتہ چینی برداشت کرنے والی بیوی کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ آدمی میرا خاوند کم اور میری ساس زیادہ ہے۔

لیکن ان سب گھریلو باتوں کو پس پشت ڈال کر ان تعلیم یافتہ لوگوں کو کیسے پیچھے چھوڑا جا سکتا ہے جو نکتہ چینی کرتے ہوئے اخلاقیات

کی قدروں کو بھی بھول جاتے ہیں اور اپنی نکتہ چینی کو تنقید کا نام دیتے ہیں۔ اگر تنقید مثبت اور تعمیری ہو تو برداشت کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی افسوس کہ اگر تنقید کا دائرہ کار ذاتیات تک پہنچ جائے تو ہر کسی کا صبر ختم ہو جاتا ہے اور صبر کے ختم ہوتے ہی ایک چھوٹا سا مسئلہ مرنے اور مارنے کی نوبت اختیار کر جاتا ہے اور اگر کہیں خدانخواستہ کسی ایک فرد کے مرنے کی بھی اطلاع موصول ہو تو ہمارا میڈیا کہاں خاموش رہ سکتا ہے؟ ہمارے میڈیا نے بھی تو جلتی پر نمک کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا ہو یا پرنٹ میڈیا کردار دونوں ایک سا پیش کرتے ہیں۔

فرق صرف یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا اپنے چینل کی ریٹینگ بڑھانے کے چکروں میں ہوتا ہے اور پرنٹ میڈیا اپنے اخبارات میں روزانہ نئی خبروں کو شائع کرنے میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ بلاشبہ میڈیا نے پاکستان کی ترقی میں بہت کام سرانجام دیا ہے خواہ الیکٹرانک میڈیا ہو یا پرنٹ میڈیا دونوں کی خدمات ڈھکی چھپی نہیں لیکن اگر کبھی انسان غلطی سے میڈیا کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کر دے تو اُس انسان کے لیے اپنی جان بچانا کسی معجزے سے کم نہیں ہوتا اس انسان کو اپنی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔

جہاں تک ملکی حالات کا ذکر کیا جائے تو ہر بار یہ سننے کو ملتا ہے کہ پاکستان دن دُگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد پاکستان ترقی یافتہ ممالک میں سرفہرست ہوگا۔ ہمارے ملک کے نام نہاد سیاست دان اور ان کے بلند و بالا دعوے خدا جانے کب پورے ہوں گے؟ پاکستان ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل بھی ہو جائے مگر اصل ترقی تو تب رونما ہو گی جب ایک ماں اپنے بچوں کو بھوک سے مرتا دیکھ کر دریا میں پھینکنے کے بجائے اُس کو دن میں تین وقت کی روٹی پیٹ بھر کر کھلا سکے گی اور جب ایک باپ ایک بیٹی کو اور بھائی بہن کو صرف غیرت کے نام پر قتل نہ کرے گا۔ مگر ان سب واقعات کو ہماری ہر نئی آنے والی حکومت یہ کہہ کر ٹال دیتی ہے کہ تعلیم اور شعور نہ ہونے کی وجہ سے اس طرح کے حادثات پیش آتے ہیں۔ گھر میں اگر روٹی اور بنیادی ضرورتِ زندگی کی چیزیں ہی میسر نہ ہو تو ایسی تعلیم اور شعور کا کیا فائدہ؟

ہر کوئی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا لیکن اگر کوئی اپنے اندر حوصلہ پیدا کرتا ہے سچ کا بول بالا کرنے کی تو بدقسمتی کے اُس کی آواز کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جاتا۔ پاکستان کے پڑھے لکھے لوگ ہو یا ان پڑھ، یا پھر ہماری ہر نئی آنے والی حکومت جو عوام

کے ووٹوں سے منتخب ہوتی ہے ان سب کا بڑا مسئلہ ہی یہ ہے کہ کوئی بھی تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ نکتہ چینی کہہ لیجئے یا پھر تنقید ان دونوں لفظوں میں میرے مطابق کوئی زیادہ فرق نہیں مگر سمجھ دار کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ ان الفاظ کو مثبت سمجھتا ہے یا پھر منفی خیر یہ تو سوچنے والے پر منحصر ہے۔

تنقید کو اگر بہترین زندگی کا اُصول سمجھ کر قبول کیا جائے تو طویل بحث کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ مگر یہی تو بات ہے کہ ہم مثبت تنقید کو بھی غلط تصور کرتے ہیں اور تنقید کرنے والے کو اپنا دشمن گردانتے ہیں۔ کچھ لوگ تو تنقید کے لفظ کو اور اس کے معنی کو جانتے ہوئے بھی انجان بنتے ہیں اور وہ ہر بار اس بات پر ہی زور دیتے نظر آتے ہیں کہ ہم تو جانتے ہی نہیں اس لفظ کا مطلب کیا ہے؟ یہ لفظ لوگ کیوں استعمال کرتے ہیں؟

ایسے لوگوں کے معصومیت بھرے انداز کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ یہ نا ہی کچھ جانے تو بہتر ہے کیوں کہ اس لفظ کو جان کر انہوں نے کون سا ملک کی خدمت کے جھنڈے گاڑھنے ہیں؟ پھر اپنی غلطی کو غلطی تسلیم کرنا ہے۔

صفائی

پاکستان کی غیور عوام اپنے گھر کی صفائی بہت شوق سے کرتی ہے۔ اگر فرش پر کبھی کوئی مکھی بھنبھناتی نظر آ جائے تو وہم کی شکار عوام ہاتھ میں جھاڑو پکڑتی ہے اور رگڑ رگڑ گھسٹتی ہے جب تک فرش میں اپنا چہرہ نظر نہ آ جائے۔ پاکستانی عوام سے مراد مرد و خواتین سب ہیں اگر کبھی بیوی گھر پر نہ ہو تو خاوند گھر کی گندگی کو دیکھتے ہوئے خود صفائی کرنے کی ٹھان لیتا ہے اور یقینا اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔ گھر کی صفائی زندگی کا اہم پیش خیمہ تصور کی جاتی ہے۔ اکثر اوقات تو خاوند گھر میں صفائی نہ ہونے کی بدولت اپنی بیوی سے ناراض ہو جاتے ہیں۔

قابل تعریف بات یہ کہ صحن میں جھاڑو لگا کر گھر کا سارا کوڑا کرکٹ گلی میں پھینک دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اپنے گھر کی

جانب لوٹنے والوں کو سب سے پہلے گندگی کا نظارہ کرنا پڑتا ہے اور دلچسپ بات یہ کہ جو لوگ گندگی سے گزر کر اپنے گھر کا رُخ کرتے ہیں ان کے گھر کی خواتین بھی بالکل ایسا ہی صفائی کرتے ہوئے فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔ یہ امر پاکستانی عوام جو چھوٹے چھوٹے محلوں میں رہتی ہے اس کے لیے تعریف کے قابل ہے کیونکہ اگر ان کا اپنا گھر صاف ہے تو پھر سب ٹھیک ہے۔

میرے اپنے گھر میں بھی کچھ ایسی ہی صورتحال ہے۔ صفائی کرنے والی کے آنے یا نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میری امی کو سکون ہی تب ملتا ہے جب وہ خود گھر کے ایک ایک کونے کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتی ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ دھول مٹی کو صاف کرتے ہوئے گھر کی خاتونِ خانہ خود گندی ہو جاتی ہے جس کی نشانی اُن کے ڈسٹ سے آلودہ کپڑوں اور چہرے سے دکھائی دے رہی ہوتی ہے مگر وہ پھر بھی مصروفِ عمل رہتی ہے۔ اگر کسی کو صاف ستھرے گھر دیکھنے کا شوق ہو تو صوبہ پنجاب کے شہر سیالکوٹ کا رُخ کرے اور مجھے یقین ہے کہ اپنا شوق پورا کرنے والا سیالکوٹ کی نسبت وہاں پر موجود گندگی سے پاک گھروں کا زیادہ دلداہ ہو جائے گا۔ خیر جتنا میں جانتی ہوں کتنے لوگوں کی جان اس پاگل پن کی وجہ

سے گئی ہے جب گھر کی خاتونِ خانہ کھانا بنانے کے بجائے میز کی مٹی اور کھڑکیوں کے پردے دھوتی رہے تو گھر کے دیگر افراد کو کھانا کہاں سے ملے بھوکا رہنے کی بدولت یا تو وہ بے ہوش ہو جائیں گے یا پھر عمر رسیدہ بزرگ جن سے بھوک برداشت نہیں ہوتی وہ اس عالمِ فانی سے کوچ کر جائیں گے اور اس طرح مرنے والے لوگ میرے اندازے کے مطابق بھوکے شہید قرار پائیں گے۔

کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے خود کو ایسا بنا لیا ہے کہ ہم خود بھی اس کے قصور وار نہیں ہم کسی کو غلط کام سے روکنے کی بجائے ہم خود بھی اس کی عادت کو اپنا لیتے ہیں اور بعد میں یہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں سب کچھ چلتا ہے یہاں کون ہم سے ہماری غلطی کا حساب لے گا؟ بلاشبہ، پاکستان میں سب جائز ہے کیوں کہ ہمارے حکمران بھی تو ایسے ہی ہیں وہ بھی تو اپنی غلطی کو قبول نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنی وضاحتوں کے لیے بڑی بڑی صفائیاں پیش کرتے ہیں۔ صفائی تو صفائی ہوتی ہے چاہے گھر کی ہو یا پھر ہمارے سیاست دانوں کی پیش کردہ صفائیاں۔ اور ایک صفائی تو وہ بھی ہوتی ہے جو گھر میں گھس کر چور سارے گھر کی صفائی کر جاتا ہے۔ مطلب گھر کا سارا ساز و سامان لوٹ کر لے جاتا اس طرح کی صفائیاں تو شاید ممکن ہیں مگر ہمارے

چہروں پر پڑی ہوئی دھول کو کون صاف کرے گا؟ جو ہماری خود کی
پیدا کی ہوئی ہے اور اس دھول کی تلافی بھی کوئی کرنے والا موجود
نہیں۔ بے شک گناہ گار ہم خود ہی تو ہیں۔

اخلاقیات یہ لفظ سوچتے ہوئے بھی شرمندگی ہوتی ہے ہماری
پاکستانی قوم تو اپنی ثقافت کی آئینہ دار تھی اور اپنی بول چال سے اپنے
اخلاق کو ظاہر کرتی تھی۔ مگر ہم نے اپنے کلچر کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے
جس کے نتیجے میں ہم آج بھی زوال پذیر ہیں۔ ہم پاکستانی تو ہیں مگر
صرف نام کے ہم نے مغربی کلچر کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے ہماری ہر سوچ
مغربی معاشرے کی تقلید کرتی نظر آتی ہے اور انڈین کلچر جو کہ ہمارے
خون میں اس حد تک رچ بس گیا ہے کہ ہم چاہتے ہوئے بھی اس سے
نجات حاصل نہیں کر سکتے اور اپنی تہذیب کو بھلا دینا ایک نالائق قوم
کی علامت ہوتی ہے جس ملک میں صفائی کی زندگی سے بھر کر قیمت ہو
وہاں اگر پاکستان میں موجود مسائل کو صفائی سے حل کرنے کے لیے
اپنی قیمتی زندگی کو قربان کیا جائے تو یقینا کچھ فائدہ بھی حاصل ہو ورنہ
زندگی کو فضول میں گنوا دینا بے مول ہے۔

خواب

میری عزیز دوست کومل بٹ جو ہمیشہ خوابوں کی دنیا میں رہتی ہے
جس کے بقول، خواب زندگی گزارنے کے راستے متعین کرتے ہیں
اور میرے خواب تو مجھے حقیقت سے آشنا کرتے ہیں۔ اس طرح کی
باتیں مجھے ہمیشہ ناگوار گزرتی ہیں۔ میری ہمیشہ کومل سے اسی بات پر
تکرار ہوتی ہے۔ میرے نزدیک وقت انسان کا بہترین ساتھی ہے۔
آج کل خواب دیکھنے کا فیشن چل نکلا ہے اگر کسی کو خواب نہ بھی رات
کو دکھائی دے تو وہ اپنے دن کے خیالات کو الفاظ کا ایسا عملی جامہ
پہناتا ہے کہ سننے والے کو وہ ایک سچا خواب لگتا ہے اگر حکومتی وزراء
کے خوابوں کی بات کی جائے تو وفاقی ہو یا صوبائی وزراء خواب وہ
تقریباً ایک جیسے دیکھتے ہیں۔ جلسوں میں خطاب کرتے ہوئے تو وہ کئی
بار بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کے بجائے بجلی کو ہی ختم کرنے کی بات

کر دیتے ہیں۔ شاید وہ سوتے ہوئے سہانے سپنے دیکھتے ہیں اور اُن سپنوں کی وجہ سے ہمارے حکومتی وزیروں کو ہر وقت بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کا خیال ذہن میں ستاتا رہتا ہے۔ اس لیے ہمارے وزیر پانی و بجلی اکثر اوقات جلسوں میں بھی سوئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بے شک وہ محنت ہی بے شمار کرتے ہیں۔

ڈگری اصلی ہو یا نقلی۔ ڈگری ڈگری ہوتی ہے۔ بہترین جملہ ہے کیوں کہ مقصد تو ڈگری کا حصول ہے تعلیم یافتہ ہونا یا نہ ہونا یہ زیادہ ضروری نہیں ہے اس لیے ہی تو میرٹ صرف دیواروں پر لکھا نظر آتا ہے۔ اگر تعلیم کی قدر ہوتی تو موم بتی جلا کر یا پھر لالٹین کی روشنی میں پڑھنے والا غریب طالب علم ریڑھی پر اپنی ڈگریاں فروخت نہ کر رہا ہوتا۔ ڈگریوں کی فروخت کا معاملہ مجھے خواب لگتا تھا لیکن یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے۔

میں وزیراعظم بنتے ہی پاکستان سے غربت اور کرپشن کا خاتمہ کر دوں گا لیکن یہ دعوے اور نعرے اگر حقیقت پر مبنی ہوں تو ہمارے وزیر خود کیسے امیر ہوں؟ مہنگی مہنگی گاڑیاں کیسے خریدے اور اپنے رہنے کے لیے اونچے اونچے محلات کیسے بنائے؟ افسوس کہ ان محلات کی دیواریں اس قدر اونچی ہوتی ہیں اور ان محلات میں رہنے والوں

کے دل اس قدر بے حس ہوتے ہیں کہ غریبوں کی صدا تک سنائی نہیں دیتی۔ لیکن پاکستانی عوام ہر بار دھوکہ دہی کا شکار ہوتی ہے اور دھوکا ملنے کے باوجود بھی اپنی روش نہیں بدلتی۔ ہر بار اپنے ووٹوں سے انہی لوگوں کا انتخاب کرتی ہے جنہوں نے سیاست کو خدمت نہیں بلکہ وراثت بنایا ہوا ہے۔ سیاست دان تو عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لئے شیخ چلی کے خواب دکھاتے ہیں لیکن ان خوابوں پر آنکھ بند کر کے یقین ہماری بے وقوف عوام کرتی ہے اور پھر اپنی کی گئی غلطیوں کا نتیجہ بھی خود بھگتی ہے۔ صوبہ سندھ کے سابق وزیراعلیٰ قائم علی شاہ جو کمال کی شاعری کرتے ہیں اور اکثر اوقات ان کی شاعری کی بازگشت نیوز چینل پر سنائی دیتی ہے۔ قائم علی شاہ خوابوں کے سحر میں گرفتار ہو کر کئی دفعہ پریس کانفرنس کرتے ہوئے دو گھنٹے میں پورے کراچی کو کوڑا کرکٹ سے صاف کرنے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ یہ اعلان سن کر کراچی والے ضرور شش و پنج کا شکار ہوتے ہونگے کہ دو گھنٹے میں گندگی کے ڈھیر صاف کرنا کیسے ممکن ہے؟

الیکشن کے دن سڑکوں پر عجیب سا سناٹا ہوتا ہے کیوں کہ آدھی سے زیادہ عوام گھروں میں سکون سے بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہوتی ہے۔ میری امی جن کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ میں جلدی سے

اپنا ووٹ ڈال آؤں تاکہ میرا ووٹ ضائع نہ ہو جائے۔ لیکن میرے بارہا سمجھانے کے باوجود بھی کہ امی آپ کے ووٹ سے ملک کی حالت نہیں بدلنی۔ افسوس ہر جگہ ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہے الیکشن والے دن لوگ دھڑا دھڑ ووٹ کاسٹ کرتے ہیں مگر جس انسان کو وہ اپنے ووٹ سے وزیراعظم منتخب کرتے ہیں وہ قومی اسمبلی میں پیش تک نہیں ہوتا۔

بلاشبہ ہماری عوام ابھی تک خوابوں کی دنیا میں ہی زندگی گزار رہی ہے اس لئے ہی تو ہر بار غلطی کو دُہراتی ہے اور اپنا حق رائے دہی استعمال کرتی ہے حالانکہ نااہل لوگوں کو ملک کا سربراہ منتخب کرنے سے بہتر ہے کہ اپنا حق رائے دہی محفوظ کر لیا جائے اور گھر میں آرام کرنے کو ترجیح دی جائے۔ یقیناً میری اس رائے سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوگا۔

مگر حکمرانوں کے روز بروز نئے نعرے سن کر خوابوں کی دنیا کی سیر کرنے سے بہتر ہے کہ ملک کی تلخ حقیقت کو قبول کر لیا جائے اور خوابوں کو صرف خواب ہی رہنے دیا جائے اور اُن کو اپنی زندگی کے مقاصد حاصل کرنے کا مرکز نہ بنایا جائے۔

تاریخ

قوموں کی زندگی میں تاریخ اہمیت کا درجہ رکھتی ہے جس طرح ایک زندہ قوم اپنی تاریخ کو تاعمر یاد رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح اپنی تاریخی عمارتوں کو بھی نہیں بھولتی لیکن اگر کسی چیز کو یاد رکھنا ہی ضرور ہوتا تو ہر باپ اپنے بیٹے کو ہر بہن اپنے بھائی کو اور ہر بیوی اپنے شوہر کو صرف اس لیے یاد رکھتی کیوں کہ ان سب رشتوں کی بدولت میری زندگی میں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں آئیں۔ افسوس کہ یاد تو مرنے والوں کو بھی کیا جاتا ہے مگر جب انسانوں کو یاد کرنے کی بات کی جائے تو ہمیں ہر رشتہ عارضی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ہر رشتہ اپنے دائرہ کار تک محدود ہے۔

یاد کے خوبصورت جھرونکوں سے باہر نکلنے کے بعد پاکستان کی اُن تاریخی عمارتوں کی طرف توجہ دینے کو جی چاہتا ہے جو کسی دور میں کسی

وقت میں پاکستان بننے کا اہم سبب رہی ہیں۔ شہرِ لاہور جہاں بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، مینار پاکستان جیسی شاہکار عمارتیں واقع ہیں۔ بادشاہی مسجد کی خستہ حالی کو دیکھ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ شاہی قلعہ جس کو تعمیر ہوئے کئی برس بیت گئے لیکن موجودہ وقت میں یہ تاریخی عمارت تاریخ کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ اپنی دکھ بھری داستان پیش کرتی نظر آتی ہے۔

مینارِ پاکستان جس کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے کہ ہمارے حکمران اپنے جلسے کرنے کے لیے مینار پاکستان کا انتخاب تو کرتے ہیں لیکن کیا انہوں نے بارش کے بعد مینار پاکستان کا منظر دیکھا ہے کہ یہی مینار پاکستان بارش کے بعد تالاب میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

عنقریب یہ تاریخی عمارتیں صرف کتابوں میں موجود تصویروں تک محدود رہ جائیں گی۔ لاہور جس کو زندہ دلانوں کا شہر کہا جاتا ہے اس سے باہر نکل کر اگر پنجاب کے امیر ترین شہر سیالکوٹ کا ذکر کیا جائے جہاں شاعرِ مشرق، مفکرِ پاکستان، حکیم الامت علامہ محمد اقبال کا گھر اقبال منزل واقع ہیں جہاں اقبال نے اپنی زندگی کا لمبا عرصہ گزارا۔ لیکن بدقسمتی کے اب اقبال منزل میں اقبال کی بنیادی ضرورت کی چیزیں تک موجود نہیں۔ بانی پاکستان قائداعظم جنہوں نے اپنی زندگی کا

آخری وقت زیارت ریذیڈنسی میں گزارا اگر ہمارے حکمرانوں کی عدم توجہ کے باعث زیارت ریذیڈنسی بھی دشمنوں کے اوچھے ہتھکنڈوں کی زد میں آنے سے نہ بچ سکی۔

دارالحکومت اسلام آباد کی حالت بھی دوسرے صوبوں سے قدرے بہتر معلوم نہیں ہوتی یہاں پر آنے والے سیاح بھی جس اذیت کا سامنا کرتے ہیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ کم از کم شہرِ اقتدار میں تو نظم و ضبط کا مظاہرہ نظر آنا چاہیے تاکہ شہر اقتدار میں سیرو سیاحت کے لیے آنے والے لوگ خوب لطف اندوز ہو سکیں۔

شاید کبھی ہماری پاکستانی عوام کے ذہن میں اس سوچ نے جنم ہی نہیں لیا کہ کیا ہم پاکستانی ہونے کا فرض ادا کر رہے ہیں؟ جس پاکستان نے ہمیں شناخت دی ہمیں آزاد قوم کا درجہ دیا کیا ہم اُس پاکستان کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں؟

ہم شعور رکھنے کے باوجود بھی جاہل ہیں ہم جہاں پر کھاتے ہیں وہی گند پھیلاتے ہیں۔ تو پھر کیا اس قوم سے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ قوم اپنی تاریخ کو یاد رکھتی ہوگی۔ اگر قائداعظم یا اقبال کی ولادت کا دن پاکستانی قوم کسی ایک فرد سے پوچھ لیا جائے تو چہرے پر سے ہوائیاں اُڑاتی دکھائی دیتی ہیں۔ جس قوم کے فرد سیلفیاں بنانے میں

اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اُس قوم کے نوجوانوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ اگر جھنڈے لگانے سے اور اونچی اونچی آواز میں ملی نغمے لگا کر سننے سے تاریخی دنوں کو یاد رکھنے کا ثبوت فراہم کیا جاتا ہے تو میرے اندازے کے مطابق پھر یہی طریقہ سب سے بہتر اور آسان ہے۔ کم از کم لمبی لمبی تاریخیں یاد کر کے دماغ خراب کرنے کی ضرورت تو نہیں پڑتی اور لوگوں کو اس بات کا بھی احساس ہو جاتا ہے کہ یہی تو نوجوان ہے وطنِ پاکستان سے محبت کرنے والے، ملک کا قیمتی سرمایہ اور بلاشبہ اب وطن پاکستان سے محبت کرنے والے اسی طرح کے نوجوان دیکھنے کو ملتے ہیں۔

خودکشی

اسلام نہایت خوبصورت مذہب ہے اور مذہب اسلام نے مسلمانوں کو بہترین اور آزادانہ زندگی گزارنے کا حق عطا کیا ہے۔ بے شک پاکستانی قوم کو ایک سچا اسلامی مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ اسلام جہاں آزادی کی بات کرتا ہے وہاں بہت سے معاملات میں سختی برتنے کا بھی قائل ہے۔ اسلام خودکشی کو بہت بڑا گناہ قرار دیتا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی زندگی کو چند منٹوں میں ختم کر دینا کسی پاگل پن سے کم نہیں۔

ہر انسان اپنی زندگی سے محبت کرتا ہے اور مشکلات تو زندگی کا حصہ ہوتی ہیں لیکن اگر مشکلات حد سے بڑھ جائیں تو انسان اپنی ہی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ خودکشی کرنے والا یہ سوچتا ہے کہ میں مرنے کے بعد کم از کم چین کی نیند تو سو سکوں گا۔ مگر انسان یہ جانتے

ہوئے بھی کہ خودکشی کرنا حرام ہے پھر بھی اپنے کیے گئے فیصلے پر نظرِ ثانی نہیں کرتا۔

آخر خودکشی کی نوبت کیوں آتی ہے؟ کیا انسان دنیا کی الجھنوں سے بے حد مجبور ہو جاتا ہے۔ ہم جس ملک میں رہتے ہیں یہاں پر روزگار نہ ہونے کے برابر ہے۔ روزگار نہ ہونے کی بدولت پاکستانی عوام باہر کے ممالک میں جا کر نوکریاں کرتی ہیں اور کچھ لوگ تو غربت کی لکیر سے بہت نیچے گر گئے ہیں۔ دن میں ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہ ہونا خودکشی کی علامت ہے۔ کب تک کوئی باپ اپنے بچوں کو بھوک کی وجہ سے مرتا ہوا دیکھ سکتا ہے؟ ہر روز اپنے بچوں کو بھوکا دیکھ کر بالآخر اس بے بس باپ کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور وہ خود بھی زہر کھا لیتا ہے اور اپنے بچوں کو بھی زہر کھلا دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ہر روز مرنے کے نسبت ایک دن مرنا بہتر ہے۔ یہ خودکشی کی پہلی مثال ہے۔ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جن کے پاس زہر کھانے کے بھی پیسے نہیں ہوتے زہر نہ ہونے کی وجہ سے وہ دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔

پاکستان کے علاوہ اور بھی بہت سے ملکوں میں خودکشی کی بڑی وجہ عشق میں ملنے والی ناکامی ہوتی ہے۔ قدیم دور کی اگر بات کی جائے

تو تب محبت میں حاصل ہونے والی ناکامی ایک مشہور کہانی کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ جو اس وقت کے لوگوں کی زبانی سننے کو ملا کرتی تھی۔ موجودہ دور کی محبت موبائل فون یا پھر فیس بک تک محدود ہے مگر میری سوچ کے مطابق ایسی محبت کرنے والوں کو مر ہی جانا چاہیے۔ کیوں کہ اگر ہم پاکستان کی بہتری کا وسیلہ نہیں بن سکتے تو ہمیں اپنے ملک کی ذلت کا ذریعہ بھی نہیں بننا چاہیے۔

ایک انسان کی تربیت میں اُس کا گھر بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پاکستانی نوجوان نسل حد درجہ جلد باز ہیں۔ گھر کا سربراہ باپ جو دن رات محنت کرتا ہے اگر گھر آ کر اُس کو علم ہو کہ میرا بیٹا امتحان میں فیل ہو گیا ہے اور وہ اپنے بیٹے سے تلخ لہجے میں بات کرے تو بیٹا غصے میں آ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیتا ہے یا پھر خود کو مار لینے کی دھمکی دیتا ہے اور ماں سچ کا ساتھ نہیں دیتی وہ بھی اپنے شوہر ہی کو غلط کہتی ہے وہ بار بار ایک ہی بات دہراتی ہے اگر میرے بیٹے کو ذرا سی بھی کھروچ آئی تو میں خودکشی کر لوں گی۔ کیا واقعتاً خود کو مارنا اتنا آسان ہو گیا ہے؟

پرائیویٹ سکول جن سے مجھے ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ والدین اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے اُن کو پرائیویٹ سکول بھیجتے ہیں۔

تا کہ ہمارے بچے بھی انگریزی زبان اچھی طرح سے بول سکیں۔ بچے انگریزی زبان سیکھتے ہیں یا نہیں اس کا جواب والدین ہی بہتر دے سکتے ہیں۔ ایسے سکولوں میں تعلیم دی نہیں جاتی بلکہ تعلیم فروخت کی جاتی ہے۔ بھاری بھر کم کتابیں جن کو رٹے لگا لگا کر بچے انگریزی زبان نہیں بلکہ سبق کو رٹا لگانے کا طریقہ سیکھتے ہیں۔ پرائیویٹ سکولوں میں پڑھنے والے بچوں میں بالکل بھی خوداعتمادی نہیں پائی جاتی جس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پر موجود اُستاد بچوں کو محنت کرنا نہیں سکھاتے بلکہ اپنا یاد کیا ہوا سبق اُن کو سناتے ہیں تا کہ وہ بچے بھی ہماری طرح کل کو ایسے ہی استاد بنے۔ جس کو کہیں بھی نوکری نہ ملے اُس کو پرائیویٹ سکول میں ضرور مل جاتی ہے۔ ان اداروں میں پڑھنے والے بچوں کی صورت حال کسی خودکشی کرنے والے انسان سے کم نہیں ہوتی۔ جس طرح گدھے پر اُس کی ہمت سے زیادہ بوجھ لاد دیا جاتا ہے بالکل اسی طرح معصوم بچوں کی زندگی کو جہنم بنا دیا جاتا ہے۔

پاکستانی سیاست میں اگر کوئی سیاست دان غلط فیصلہ کرے تو مخالف جماعتیں طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتی ہے یہ تو سیاسی خودکشی ہے یہ تو اپنی موت کو خود دعوت دینے کے برابر ہے۔ یقینا سیاسی لوگ اسی انداز میں بات کرتے ہیں۔

لیکن عہدِ حاضر میں خودکشی ایک عام سا لفظ ہو گیا ہے اس لیے اب اس لفظ میں بھی تبدیلی آنی چاہیے کیوں کہ موجودہ وقت لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مثبت تبدیلی کا بھی تقاضا کرتا ہے۔

پانامہ لیکس

ٹیلی ویژن کو آن کرتے ہی مجھے عجیب سا دھچکا محسوس ہوا پہلے تو میرا خیال تھا بھونچال آیا ہے لیکن ٹی وی کی جانب جیسے ہی میری نگاہ گئی تو احساس ہوا بھونچال ٹی وی پر آیا ہے۔ نیوز چینل جہاں پر ہر وقت سیاسی گہما گہمی عروج پر ہوتی ہے مگر اب کی بار صورت حال مختلف تھی وہ اس طرح سے کہ تمام نیوز چینل بار بار ایک ہی نیوز دے رہے تھے کہ وزیراعظم نواز شریف کی باہر کے ممالک میں آف شور کمپنیاں ہیں۔ پانامہ لیکس نے نواز شریف کا بھانڈہ پھوڑ دیا ہے۔ ہر طرف ایک ہی خبر سن کر میرے کان پک گئے تھے مگر مجھے پھر بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی پانامہ لیکس کیا ہے؟ آخر کار اپنے بھائی کا سر کھانے کے بعد مجھے سمجھ آ ہی گئی۔ خیر، عوام کا پیسہ لوٹ کر باہر کے ملکوں میں کمپنیاں کھولنا یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کیوں کہ ہر نیا حکمران ایسے ہی

کرتا ہے۔ افسوس کہ نواز شریف کی قسمت بُری تھی جو یہ خبر اُن کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔ گلی، محلے میں صرف ایک ہی بات کہ اب نواز شریف کو استعفیٰ دے دینا چاہئے۔ ملک کی خدمت کے نام پر نواز شریف نے عوام کو بہت لوٹا ہے۔ میرا اپنا گھر بھی پانامہ لیکس کی نذر ہو گیا تھا۔ صبح دوپہر شام صرف ایک ہی موضوع اب نواز شریف وزیراعظم رہے گا یا نہیں۔

ٹی وی کو آن کرنا میرے لیے ایک جرم بن گیا تھا۔ پاکستان تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان اُن کی سیاست ہی اب شروع ہوئی تھی۔ حکومتی جماعت پر گولے برسنے کا سلسلہ جاری تھی۔ عمران خان صاحب کی صرف ایک ہی ضد تھی نواز شریف اب نااہل ہو چکے ہیں اب وہ وزیراعظم نہیں رہے اُن کو استعفیٰ دے دینا چاہیے۔ اب نواز شریف وزیراعظم رہنے کا اخلاقی جواز کھو بیٹھے ہیں۔

سیاست دانوں کی زبان سے اخلاقیات کا لفظ سن کر ہنسی آتی ہے۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی ضد میں ہمارے سیاستدان اپنے جلسوں میں اخلاقیات کا جو مظاہرہ کرتے ہیں وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ حکومتی اراکین اپنے وزیراعظم پر ہونے والی تنقید کو بھلا کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟

ہر زبان پر ایک ہی بات کہ آئس لینڈ کے وزیراعظم نے اپنی کرپشن ثابت ہونے سے پہلے ہی استعفیٰ دے دیا۔ اب نواز شریف صاحب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ پاکستانی عوام پر رحم کھاتے ہوئے اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں؟ مگر وزیراعظم ہاؤس کو چھوڑنا اتنا آسان کام نہیں۔

خیر 2016ء کا سال نواز شریف کے لیے کوئی اچھا سال ثابت نہ ہوا لیکن پانامہ لیکس کا معاملہ کچھ دیر کے لیے رفع دفع ہو گیا۔ لیکن ختم نہ ہوا اور اپوزیشن جماعتوں نے نواز شریف کو نااہل ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی بالآخر سپریم کورٹ نے نواز شریف کو نااہل قرار دے دیا وزیراعظم کا عہدہ چھن جانے کا غم شریف فیملی کے لیے کسی بُرے خواب سے کم نہ تھا کہ شریف فیملی کو ایک بڑا جھٹکا یہ لگا کہ اب نواز شریف مسلم لیگ ن کے صدر بھی نہیں رہ سکتے کیوں کہ ایک نااہل شخص سیاسی جماعت نہیں چلا سکتا۔

مگر نواز شریف نے جرأت مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے شاہد خاقان عباسی کو وزیراعظم بنا دیا۔ بدقسمتی وہ وزیراعظم تو بن گئے لیکن نہ ہونے کے برابر کیوں کہ مسلم لیگ ن شاہد خاقان کو اپنا وزیراعظم تسلیم نہیں کرتی اور خود شاہد خاقان عباسی بھی یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

میرا وزیراعظم نواز شریف ہے۔ میں تو صرف اُن کی کمی پوری کر رہا ہوں۔ پانامہ لیکس نے نواز شریف کی کشتی تو ڈبو دی لیکن اب حکومتی وزیرخزانہ اسحاق ڈار کی سیاست بھی پانامہ لیکس کی زد میں ہے اُن کی ناؤ کب ڈوبے گی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ پاکستان تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان جنہوں نے نواز شریف کی نااہلی کو پاکستان کا روشن مستقبل قرار دیتے ہوئے خوب جشن منایا۔ سیاست میں اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان صاحب کے سر پر بھی نااہلی کی توار لٹک رہی ہے وہ تلوار اُن کا سر کب قلم کرتی ہے؟ یہ سیاسی اعداد و شمار سے پتا چل جائے گا لیکن خان صاحب ٹی وی ٹاک شوز میں اکثر یہ بیان دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اگر میں نااہل ہو گیا تو میں اپنی سیاسی جماعت میں الیکشن کراؤں گا جو الیکشن جیتے گا وہ پارٹی کا صدر منتخب ہوگا۔ خان صاحب کس دل سے یہ بات کہہ رہے ہوتے ہیں یہ تو وہی جانتے ہیں۔ پانامہ لیکس نے پاکستانی سیاست کا بوریا بستر گول کر دیا ہے مگر اب بھی پانامہ کے حملے جاری ہیں ان حملوں کی زد میں آنے والا آخری سیاست دان کون ہوگا؟ یہ جلد معلوم ہو جائے گا۔

یونیورسٹی

کالج سے یونیورسٹی کا سفر طے کرنا میرے لیے کسی خواہش سے کم نہیں تھا اور میں خود کو خوش قسمت تصور کرتی ہوں اس لیے کہ میں نے اعلیٰ تعلیم جی سی ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ سے مکمل کی ہے اور اسی یونیورسٹی سے اپنے تعلیمی سفر کو مزید جاری رکھا ہوا ہے۔ سیالکوٹ صوبہ پنجاب کا امیر ترین شہر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیالکوٹ میں امیر لوگ رہتے ہیں۔

سیالکوٹ امیر شہر ہے یا نہیں اس پر تحقیق کی ضرورت ہے لیکن ایک بہترین کام جو قابلِ تعریف ہے وہ ڈگری کالج سیالکوٹ کو یونیورسٹی کا درجہ دینا ہے سیالکوٹ یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کرنا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ تو دے دیا گیا ہے اور ہر اچھی یونیورسٹی کی طرح اس یونیورسٹی میں بھی پی ایچ

ڈی اسکالر موجود ہیں جو اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اور اگر یونیورسٹی کی سکیورٹی کے متعلق بات کی جائے تو ہمیں یونیورسٹی کے چاروں اطراف حفاظتی اقدامات نظر آتے ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔ محترم پروفیسر ڈاکٹر فرحت سلیمی جو جی۔ سی ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ کی وائس چانسلر ہیں ان کی دن رات کی محنت کی بدولت یونیورسٹی کی حالت قدرے بہتر ہوگئی ہے اور وائس چانسلر صاحبہ کی خدمات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ چونکہ میں ہمیشہ سے تبدیلی کی خواہش مند رہی ہوں اور اس تبدیلی کی جو مثبت کاموں پر مبنی ہوں۔ اور وہ تبدیلی جو لوگوں کی سوچ کی زاویے بدل دے، ہر ایک کو حرکت کی جانب مائل کریں۔ اہلِ قلم لوگوں سے اکثر اوقات میری بات چیت ہوتی رہتی ہے اور یقینا وہ تمام اہلِ قلم حضرات بہت اچھی سوچ کے مالک ہیں لیکن جب وہ مجھ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی تعلیم کہاں سے حاصل کی ہے؟ تو میں بہت فخریہ انداز میں جواب دیتی ہوں۔ سر جی۔سی ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ سے میں اپنی بات مکمل بھی نہیں کرتی کہ وہ میری بات کو کاٹتے ہوئے بولتے ہیں بہت افسوس کی بات ہے کہ اس ادارے سے جہاں آپ نے اپنی پڑھائی مکمل کی ہے وہاں تو کرسیاں بھی مکمل نہیں ہیں اور

لائبریری بھی بہت محدود ہے۔ اُن سب حضرات کی رائے جان کر اور اُن
کی باتیں سُن کر مجھے بہت غصہ آتا ہے لیکن وہ غلط بھی نہیں کہتے کیوں کہ
ماضی میں تو یہ یونیورسٹی اسی طرح کی مشکل سے دوچار تھی اور تقریباً اس
سے ملتی جلتی صورت حال اب بھی موجود ہے۔

مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے یہ دیکھ کر اتنی بڑی یونیورسٹی میں صرف
ایک کنٹین ہے۔ یونیورسٹی میں موجود لڑکیاں اپنی بھوک کو مٹانے کے
لیے کسی کا بازو کھینچتی ہے اور کسی کو زور دار دھکا دیتی ہیں۔ اس دھکم
پیل کو دیکھ کر مجھے کئی بار ڈر لگتا ہے کہ کوئی حادثہ رونما نہ ہو جائے۔
اس لیے میں نے صرف سات آٹھ بار یونیورسٹی کی کنٹین میں قدم
رکھا۔ میری دوستیں جو میرے لیے کسی تحفے سے کم نہیں وہ ہمیشہ میرے
لیے کنٹین سے کچھ نا کچھ کھانے کے لیے لے آتی ہیں اور سب سے
بڑھ کر یہ کہ میں نے کبھی لائنوں میں لگ کر فیس بھی جمع نہیں کروائی
میری فیس بھی وہی جمع کرواتی ہیں۔ خیر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں
بہت سست ہوں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جہاں بھیڑ ہو وہاں مجھے بہت
زیادہ گھٹن محسوس ہوتی ہے اور میرے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا
ہے۔

اور اگر چھٹی کے وقت کی بات کی جائے تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ

جیسے ساری دنیا اس ہی یونیورسٹی میں آ گئی ہے اور ہر کوئی آگے بڑھنے
کے چکر میں دوسرے کو دھکا دینے میں مصروفِ عمل نظر آتا ہے۔

خدانخواستہ کسی دن بارش برسنا شروع ہو جائے تو بارش کے بعد
سیالکوٹ یونیورسٹی کا منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی سڑک تالاب
کا نظارہ پیش کرتی نظر آتی ہے اور ایک بار تو میری دوست بال بال
گرنے سے بچی لیکن اب ایک نہایت قابلِ تعریف کام جو کیا جا رہا
ہے وہ یونیورسٹی کو سیالکوٹ کے کسی دوسرے شہر میں منتقل کرنے کا
ہے۔ میں ہمیشہ سے اس بات پر بضد رہی ہوں کہ یونیورسٹیاں آپ کو
نہیں بناتی بلکہ آپ یونیورسٹیوں کو بناتے ہیں ایک طالب علم کی کامیابی
اُس کی یونیورسٹی کی کامیابی ہوتی ہے۔

مگر جو ساری صورت حال میں نے پہلے بیان کی اس کو بیان
کرنے کا میرا مقصد ہرگز نکتہ چینی کرنا نہیں۔ میں تو صرف اصلاح کی
متلاشی ہوں اور اگر اصلاح کی بات کی جائے تو اصلاح کی ذمہ داری
صرف ملک کے حکمرانوں یا پھر یونیورسٹی انتظامیہ پر ہی عائد نہیں
ہوتی۔ بہتری تب آتی ہے جب یونیورسٹی میں موجود ہر طالب علم اپنا
مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ اگر دل کو تسلی دینے والے نعروں کی بات کی
جائے تو میری کم علمی ہی سمجھ لیں مگر دعوؤں اور نعروں نے آج تک

ملک کا کچھ نہیں بدلا ہم کل بھی ویسے تھے ہم آج بھی ویسے ہیں۔ قصور صرف یہ ہے کہ ہم اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنے اوپر عائد کی گئی ذمہ داری کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ جس کی بدولت ہم مفلسی کا شکار ہیں۔

بہت ہو چکا

بہت ہو چکا اب یہ سلسلہ رک جانا چاہئے۔ آخر کب تک تعلیم کے نام پر نوری کو بیچا جاتا رہے گا؟ حقیقت سے آشنا ہونے کے باوجود بھی ہم چپ ہیں کیوں کہ ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ پاکستان میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں، دراصل انصاف موجود ہی نہیں۔ ناانصافی دیکھ کر انصاف کا پیمانہ لڑکھڑا چکا ہے اور کوئی شک نہیں کہ بہت جلد ناانصافی کا لفظ عام ہوگا اور انصاف کیا ہوتا ہے؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔

میں صاحب کتاب بھی ہوں اور کالم نگار بھی بلاشبہ رائٹر بہت حساس ہوتا ہے۔ وہ غلط چیزوں کو برداشت نہیں کر سکتا اور میرا سب سے بڑا گناہ ہی یہ ہے کہ میں سچ لکھنے پر مجبور ہوں اور وہ بھی کڑوا سچ، سی۔ ٹی۔ آئی کی نوکریاں پنجاب حکومت کمیشن کی طرف سے نوجوانوں کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں۔ مگر تحفہ جان لیوا بھی ثابت ہو

سکتا ہے یہ کبھی سوچا نہیں تھا۔ نوکری حاصل کرنے والے امیدواروں
کی لائن دیکھ کر پہلے پہل تو مجھے یوں لگا شاید بجلی کا بل جمع ہو رہا ہے۔
مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا جب میری کلاس میٹ مجھے ملی اور کہنے لگی
حمیرا جلدی سے لائن میں لگ جاؤ ورنہ تمہارا انٹرویو بہت دیر سے
ہوگا۔ میں اپنی دوست کے کہنے کے باوجود بھی لائن میں نہ لگی اور
اردگرد کھڑے لوگوں کا چہرہ بغور دیکھتی رہی۔ ہوا کچھ یوں کہ صبح کے
آٹھ سے رات کے چھ بج گئے مگر انٹرویو ختم نہ ہوئے۔ کیوں کہ نوکری
لینے والی عوام بہت زیادہ تھی۔ مائیں جو اپنی بیٹیوں کے انٹرویو کے
لیے تپتی ہوئی دھوپ میں کھڑی رہیں کہ اللہ کرے اب میری بیٹی کا نام
آ جائے اور ہم گھر چلے جائیں ایسی کوئی نوبت ہی پیش نہ آئی کیوں
کہ صبح کا سورج غروب ہو گیا مگر انٹرویو کا پیغام تب آیا جب رات
کے چاند کی آمد آمد تھی۔

یقینا نوکری کے منتظر امیدوار جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن
یہ کہاں کا اصول ہے؟ کہ اُن سے بُرے لہجے میں مخاطب ہوا جائے
اور شرم سے ڈوب مرنے کا مقام یہ کہ جو پہلے سے سی۔ ٹی۔ آئی کی
نوکری کر چکے ہیں اُن کا پھر انٹرویو لیا گیا۔ اور ان کو لائن میں لگنے
والے امیدواروں کی نسبت زیادہ ترجیح دی گئی۔

یقینا کوئی بھی اصولوں سے بالاتر نہیں ہوتا لیکن اگر اصول قائم
کیے جائیں تو یہ فرض بنتا ہے کہ اُن کا اطلاق سب پر کیا جائے لیکن کسی
انسان کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا کوئی چھوٹا جرم نہیں۔

پاکستان کا المیہ ہی یہ ہے کہ یہاں پر ہر کوئی خود ہی عدالت، خود
ہی مدعی اور خود ہی جج بن گیا ہے اور بہتری کی توقع رکھنا فضول سی
بات ہے۔ اہلِ قلم بننا کوئی آسان کام نہیں اس کے لیے بہت ہمت
اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لکھاری جو پہلے ہی معاشرے میں
ہونے والے ظلم اور ناانصافی کو دیکھ کر کڑھتا رہتا ہے اُس کے لیے کم
ازکم نوکری کا حصول تو آسان ہونا چاہیے۔ ورنہ عنقریب لکھاری بھی
خودکشی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ زمانہ ماضی کی اگر بات کی جائے تو
پاکستان میں رہتے ہوئے بھی بہت سے لکھاریوں نے خودکشی کی لیکن
ضروری نہیں کہ ان کی خودکشی کے پیچھے محبت کا پہلو نمایاں ہو یقینا ان کو
معاشی مسائل بھی درپیش تھے۔ افسوس کہ موجودہ عہد میں بھی اس سے
ملتی جلتی صوت حال کا سامنا ہے۔ آج بھی اہلِ قلم کو کم تر نگاہوں سے
دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی عزت وتکریم کے بجائے معاشرے میں
اُس کے وجود کو فضول تصور کیا جاتا ہے۔ بہت ہو چکا ان دولفظوں کا
استعمال ہر کوئی اپنے مطابق کرتا ہے مگر لکھاری ان دولفظوں کا استعمال

تب کرتا ہے جب معاشرے میں ناانصافی، کرپشن اور قتل و غارت کا رواج عام ہو جائے اور ان دو لفظوں کی اس سے بہترین وضاحت بھی بے شک ایک لکھاری ہی کر سکتا ہے۔ کیوں کہ لکھنے والے کی قلم ہر بند سے آزاد ہوتی ہے اور اس کی قلم کو کسی بھی زنجیر سے باندھا نہیں جا سکتا۔

دشمن

''پاک چین دوستی زندہ باد''۔ یہ نعرہ تو روزنہ ہر خاص و عام کی زبان پر سننے کو ملتا ہے۔ دوستی ہو تو پاکستان اور چین جیسی چین نے ہمیشہ ہر مشکل صورت حال میں پاکستان کا ساتھ دیا ہے۔ سی۔ پیک منصوبہ یہ پاکستانی عوام کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں اور بلاشبہ پاکستان اور چین کی دوستی مثالی ہے۔ دوستی کو پش پشت ڈال کر اگر دوستی کے متضاد لفظ یعنی دشمنی کی بات کی جائے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ دشمنی کی صف میں پاکستان اور بھارت کا ذکر نہ آئے لیکن پاکستان اور بھارت کی دشمنی کی داستاں چوں کہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، بلاشبہ کوئی بھی ملک کمزور نہیں لیکن کسی بھی ملک کی کمزوری تب کھل کر سامنے آتی ہے جب اُس ملک کے لوگوں کی سوچ میں یکسانیت نظر آئے اور عوام کے لیے ملکی مفاد سے زیادہ اپنا مفاد عزیز ہو جائے۔

تعلیم ایک باشعور قوم کی نشانی ہے لیکن اگر مجھ سے کوئی یہ سوال کرے کہ کیا پڑھ لکھ کر انسان باشعور ہو جاتا ہے تو میرا جواب ہوگا کہ ہرگز نہیں کیوں کہ اگر انسان اتنا ہی باشعور ہے تو پھر وہ کیوں مسجدوں، درباروں، مدرسوں کو بم سے شہید کرتا ہے حالانکہ بم دھماکے کرنے والا بھی تو انسان ہی ہوتا ہے لیکن وہ اتنا باشعور کیوں نہیں ہوتا یہ مسئلہ بحث طلب ہے۔ اگر ایک تعلیم یافتہ انسان کی بات کی جائے تو میرے خیال سے کوئی بھی انسان جتنا مرضی پڑھ لکھ جائے لیکن حسد کا پہلو اس میں ضرور پوشیدہ ہوتا ہے وہ محض حسد کی بنیاد پر اپنے سب سے اچھے دوست کو اپنا دشمن بنا لیتا ہے اور یہ حسد صرف دوستوں میں ہی نہیں ہوتا بلکہ استاد جس کو بہت بلند مقام حاصل ہے استاد کے بارے میں بات کرتے ہی مجھے تکلیف محسوس ہوتی ہے کہ کیا ایک استاد بھی دشمن ہو سکتا ہے؟ میرے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا کسی اذیت سے کم نہیں، لیکن یقیناً حقیقت تلخ ہوتی ہے۔ حقیقت کو قبول کرنے کا حوصلہ ہر ایک میں نہیں ہوتا۔ استاد دشمن کیسے بنتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کسی دشمنی سے کم نہیں کہ آپ کا اپنا استاد صرف پسندیدگی کو بنیاد بنا کر میرٹ کی دھجیاں اُڑا دے۔ اگر کوئی یہ کہیں کہ موجودہ دور میں یہ سب ممکن نہیں تو میرے خیال میں اُس سے بڑھ کر بے وقوف کوئی اور نہیں

ہو سکتا۔ آپ کے قریبی لوگ ہی آپ کے دشمن کا کردار ادا کرتے ہیں کسی اور سے دشمنی کی امید رکھنا پاگل پن ہے۔

کسی حقدار سے اس کا حق چھیننا کسی دشمنی سے کم نہیں۔ اگر آپ کو کبھی ایم فل یا پھر کسی بھی تعلیم کے شعبے میں داخلہ لینے کا اتفاق ہو تو کبھی غور کیجئے گا کیسے آپ کا حق چھین کر سفارش کرنے والے بندے کو دیا جائے گا؟ اور اس کی سفارش آپ کی ڈگریوں سے زیادہ اہم ہو گئی۔ افسوس کہ اب ہر ایک نے اپنے گریبان میں جھانکنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہر کوئی اپنا احتساب کرنے بیٹھے تو میری کم علمی کے مطابق وہ سزا یافتہ مجرم سے کم کا حقدار نہیں ہوگا۔

دشمن یہ لفظ اس قدر اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ اگر کسی کو ناانصافی کا ذرا برابر بھی اندیشہ ہو تو وہ یہ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے یہ بچپن سے میرا دشمن تھا۔ اس لیے ہی تو میری کامیابی برداشت نہیں کر سکا اور دشمنی پر اُتر آیا۔ معاشرہ تو کہیں پیچھے رہ جاتا مگر ہمارے دوست احباب ہی دشمنی نبھانے کی لائن میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔

مشہور ہے کہ پاکستان کا دشمن بھارت ہے۔ بھارت کو پاکستان کی کامیابی ہضم نہیں ہوتی۔ بلاشبہ بھارت پاکستان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے نظریں نہیں چرائی جا سکتیں۔

لیکن اُن دشمنوں کا کیا کیا جائے؟ جو پاکستان میں رہ کر وطنِ عزیز کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مسلمان ہی مسلمان کا دشمن بن گیا ہے۔ آخر کیوں مسلمان ہی مسلمان کا دشمن بن گیا کبھی ہم نے یہ سوچنے کی زحمت کی، حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں بیرونی دشمنوں کے بجائے اپنے ملک میں موجود اندرونی دشمنوں سے لڑنے کی ضرورت ہے ہمارے ملک میں فرقہ واریت عام ہوگئی ہے جس کی بدولت ہمارے دشمن ممالک کو پاکستان پر حملہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ پاکستان کا دشمن پہلے مسلمانوں کو آپس میں لڑواتا ہے اور بعد میں تماشا دیکھتا ہے۔

ہمارا دشمن دراصل ہمارے اندر موجود ہے جو مختلف طریقوں سے اپنی اصلیت ظاہر کرتا ہے۔ ملکی دشمنی کے علاوہ ہمارے اپنے قریبی رشتہ دار ہی دشمنی نبا رہے ہوتے ہیں لیکن ہم پاکستانی قوم صرف نظر انداز کرنے کو ہی غنیمت سمجھتے ہیں۔

نقطہِ نظر

میں کہاں غلط ہوں؟ میرا قصور مسلمان ہونا ہے یا پھر پاکستانی، کیوں آج بھی انصاف کا لفظ چھوٹا لگتا ہے؟ پاکستانی عوام دھوکے باز ہے واقعتا اس میں سچائی ہے کیوں کہ ہم ابھی تک نہیں جانتے کہ ہم نے اپنے آپ کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے یا نہیں اس سے بڑھ کر دھوکا اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے ملک کے ساتھ ہی مخلص نہیں؟ ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہوتے ہیں لیکن برابری کا معیار اُس وقت گرتا ہے جب دھن کا استعمال سرعام کیا جاتا ہے۔ ریڑھیوں پر سبزی اور فروٹ تو بکتا ہے مگر اگر کبھی ریڑھیوں پر ڈگریاں بھی بکنی شروع ہو جائیں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا ویل ڈن پاکستان۔ کسی حقدار کا حق چھیننا ہو تو دولت مند سے رابطہ کرنا چاہیے کیونکہ حق کے لیے دلیلوں کی نہیں بلکہ دولت کی ضرورت پڑتی ہے۔ سیاست دان بننا کوئی مشکل کام نہیں

ہر کوئی سیاست دان بن سکتا ہے اس کے لیے تعلیم کی ضرورت نہیں صرف امیر خاندان سے تعلق شرط ہے اور میری نوکری کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھانے والوں کو نصیحت ہے پڑھائی چھوڑ کر سفارش کرنے والے کو تلاش کریں تاکہ نوکری تو مل جائے اور سفارشی کی قابلیت کو جانچنے کے لیے اُس شخص کی ماضی میں کی گئی سفارشوں کی فہرست ڈھونڈیں اور تحقیق کریں کس حد تک اُس کی سفارشیں کامیاب ہوئی ہیں۔ ایک اہم بات سفارش کرنے والے کا حکومت سے رابطہ ہونا ضروری ہے وہ رابطہ بالاواسطہ ہو یا پھر بلاواسطہ یہ آپ پر منحصر ہے۔

صحرا میں جانے کا اگر کسی کو اتفاق نہ ہوا ہو تو پاکستان میں رہ کر صحرا میں جا سکتا ہے جس کا آسان فارمولا اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ اگر گھر میں بجلی نہ ہو اور ٹینکی میں پانی بھی ختم ہو جائے تو بدقسمتی سب سے بڑھ کر گیس بھی چلی جائے۔ تو میرے اندازے کے مطابق صحرا میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ گھر میں رہتے ہوئے صحرا کی سیر کر سکتے ہیں۔ اگر سمندر دیکھنے کو دل کر رہا ہو تو بارش کے بعد کراچی کی سڑکوں کو دل بھر کے دیکھ لینا کسی سمندر سے کم نہیں۔

انگریزی زبان سیکھنے کے لیے کسی اکیڈمی کا یا پھر اُستاد کا ہونا ضروری نہیں ہوتا اس کے لیے آپ کے پاس ایسا ہنر ہونا چاہیے کہ

سننے والے کو غلط انگریزی بھی درست سنائی دے۔ کسی چور کے چہرے کو غور سے دیکھا جائے تو اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نہیں بلکہ غرور دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ یہ کیا کم ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھوک سے مرنے کے بجائے چوری کیے ہوئے پیسے سے کھلا رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ چور کو دنیا بے غیرت سمجھتی ہے اور بند دروازے سے چوری کرنے والے کو عزت دار۔

ضرورت مند کے منہ پر نہیں لکھا ہوتا وہ ضرورت مند ہے اس کے لیے خوب محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ضرورت مند کو جاننے کے لیے کوئی کتاب پڑھنا ضروری نہیں بلکہ آپ کی آنکھیں دل کی بات دوسروں تک منتقل کر دیتی ہیں۔ اس لیے تو کہنے والے نے خوب کہا ہے کہ اگر کوئی آپ کی آنکھوں کو دیکھ کر آپ کی ضرورت کو نہ سمجھ سکے تو پھر اُن آنکھوں کا کیا فائدہ؟

رائٹر بننا کوئی آسان کام نہیں اس کے لیے خونِ جگر کرنا پڑتا ہے۔ مگر تنقید کرنا بہت ہی آسان ہے کتاب کو لکھ کر اُس کو شائع کروانا اور اشاعت کے مراحل میں پیش آنے والی مشکلات کا سامنا کرنا ایک رائٹر کا ہی کام ہے ہم دراصل بے حس اور خود غرض ہو چکے ہیں ہم سے کسی کی کامیابی برداشت نہیں ہوتی اور اس کو ناکام ثابت کرنے

کے لیے ہم پوری کوشش کرتے ہیں۔

حالانکہ عزت اور ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت سے۔

حقیقتاً سیکھتا وہی ہے جو سوال کرتا ہے اور سوال بھی وہی کرتا ہے جو خوداعتماد ہوتا ہے۔ ایک لائق طالب علم ضروری نہیں کہ ہر میدان میں لائق ہو کتاب میں موجود ہر موضوع صرف یہ بتاتا ہے کہ اس موضوع کا تعلق کس سے ہے؟ سماجیات سے، معاشیات سے یا پھر ادبیات سے؟ یہ نہیں بتاتا کہ رٹا کیسے لگانا ہے؟ اور سبق کو رٹا لگا کے نمبر کیسے حاصل کرنے ہیں؟

ہماری پاکستانی عوام ابھی تک نمبر گیم کا شکار ہے۔ ہر کوئی ایک ہی سوچ میں دوچار نظر آتا ہے کہ کاش میرے دو نمبر زیادہ ہوتے تو میرا بھی اے گریڈ بن جاتا اور مجھے بھی نوکری مل جاتی۔ نوکری تب ملتی ہے جب آپ بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں اور نوکری تجربہ مانگتی ہے نوکری کے منتظر افراد کو اس شق کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

بلاشبہ پاکستان کی نوجوان نسل قابلیت کے پیچھے نہیں بلکہ اے پلس گریڈ کے پیچھے بھاگتی ہے کیونکہ نوجوان نسل کو قابلیت اور علم کا نہیں بلکہ محض اے پلس گریڈ کا لالچ ہوتا ہے۔

ذرا سوچ

کبھی خود سے سوال کرتے ہوئے انسان پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اپنا احتساب کرنا یا خود سے سوال کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہر انسان اپنا احتساب کرنا چاہتا ہے۔ لیکن خدا جانے! پھر وہ کیوں خود سے ڈرتا ہے؟ حالاں کہ اُس کی کی ہوئی غلطیوں کی باز پرس کوئی غیر تو نہیں کر رہا ہوتا لیکن آخر ایسا کیا ہو گیا ہے کہ ہر انسان اپنے آپ سے بھاگ رہا ہے۔

شاید وہ سچ کا سامنا نہیں کرنا چاہتا یا پھر سچ جانتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ جن لوگوں کے بیچ ہم رہتے ہیں یہاں پر موجود ہر انسان نفسا نفسی کا شکار ہے اُسے صرف اپنی ذات کی فکر ہے، کسی کے دکھ، تکلیف سے کوئی سروکار نہیں۔ جس کی بدولت خود سے دور ہونے کا سوال تو بہت بعد میں اُٹھتا ہے درحقیقت ہم خود غرض ہو چکے ہیں۔

جس کی مثال میں مَیں کسی کا نام لینے کے بجائے خود کو شامل کرنا زیادہ مناسب سمجھتی ہوں کیوں کہ میں بھی تو اسی معاشرے اور انہیں لوگوں کا حصہ ہوں۔ خود کا جائزہ لیتے ہوئے شاید میں بھی کئی دفعہ من مانی کروں اور من مانی کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ کیا کم ہے؟ میں کسی کو جواب دہ نہیں۔ اپنے اچھے بُرے کی میں خود ذمہ دار ہوں۔

زندگی سے ہر انسان محبت کرتا ہے اور محبت کرنی بھی چاہیے۔ کون جانتا ہے؟ کہ کب میرے ساتھ کیا ہو جائے؟ کوئی بھی اپنی زندگی کی گارنٹی نہیں دے سکتا ہنستے کھیلتے انسان پل بھر میں ہم سے جدا ہو جاتے ہے۔ ابھی تو یہ انسان ہمارے درمیان موجود تھا لیکن کیا ہوا کہ یہ مر گیا، شاید اس نے زہر کھا لیا ہو یا پھر محبت میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ دراصل جہاں ہم رہتے ہیں وہاں ہر انسان حادثتاً موت کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے۔

جس کی بنیادی وجہ ہمارے ذہن کی گندگی ہے جو کبھی بھی صاف نہیں ہوسکتی۔ تعلیم انسان کو باشعور بناتی ہے لیکن جب کسی کے متعلق بات کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ہمارا باشعور ہونا بہت پیچھے رہ جاتا ہے ہم محض دوسروں کی نظر میں اچھا بننے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

یونہی کوئی بھی غیر آپ سے ہاتھ نہیں ملاتا ہر انسان آپ کی حیثیت، آپ کا مقام دیکھ کر آپ سے ہاتھ ملاتا ہے۔ کامیاب ہونے کے لیے تو سب ہی محنت کرتے ہیں لیکن محنت اُس وقت محنت کہلاتی ہے جب آپ کی پہچان ہوں جب آپ کا شمار بے شمار میں نہ ہو جائے۔ زندگی تو ہر انسان گزارتا ہے لیکن اُس زندگی کی قدر ہی الگ ہوتی ہے جو نڈر ہو کر اور بے باک ہو کر گزاری جائے۔

مرنے کے بعد ہر انسان نے مٹی کے نیچے ہی دفن ہونا لیکن اُس کے باوجود بھی شاید قبرستان کو دیکھ کر ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ لوگ جو عظیم کام کر کے گئے دفن تو وہ بھی آخر مٹی کے نیچے ہی ہوئے انسان کا آخر صرف مٹی ہے۔ قبرستان جہاں ہزارہا لوگ دفن ہے یقیناً وہ مزید زندہ رہنا چاہتے ہوں گے لیکن اُن کی زندگی نے اُن کو مہلت نہیں دی اور وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کی خواہشات اور بہت سے کام ادھورے ہی رہ گئے۔ ان سب سچائیوں سے آگاہ ہونے کے باوجود بھی کہ زندگی مختصر ہے اور اس مختصر زندگی کو ہر آنے والے انسان کی راہنمائی کا سبب بنانے کے بجائے ہم فیشن اور نت نئ مصروفیات میں الجھے ہوئے ہیں اور ستم یہ کہ مصروفیات بھی ہماری اپنی پیدا کردہ ہے کہانی شروع ہوئی اور ختم ہوگی انسان بھی ایک کٹھ پتلی کی

مانند ہے کبھی کسی کے ہاتھ کا کھلونا اور کبھی کسی ہاتھ کا ہر کوئی اس سے کھیلتا ہے یا آسان لفظوں میں اس کا استعمال کرنا ہے۔ انسان بھی ایک کہانی کی مانند ہے وہ کہانی جو شروع ہوتے ہی تجسس کا شکار بنا دیتی ہے کہ آگے کیا ہو گا لیکن آگے آنے والا ہر موڑ بھول بھلیوں کی طرح ہوتا ہے وہ بھول بھلیاں جس کے اندر انسان داخل تو ہو جاتا ہے لیکن باہر نہیں نکل پاتا۔ انسانی زندگی بھی کچھ اسی طرح ہے۔

اگر انسان تھوڑا سا وقت نکال کر اپنے ہر بیتے ہوئے لمحے پر غور و خوض کرے کہ اُس نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ تو انسان کی مشکلات کم ہو جائیں اور اُس کی اپنی زندگی اُس کے لیے آسان ہو جائے۔ دو لفظ جو بہت معنی خیز ہے اور انسانوں کے لیے مشعل راہ ''ذرا سوچ'' انسان کی ساری زندگی صرف ان دو لفظوں کی محتاج ہے۔ محض غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔